ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

جولائی ۲۰۲۳ء

۱۵/روپے

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

جناب وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اندرا گاندھی پرتشٹھان میں ’آکانشاہاٹ‘ کاافتتاح کرتے ہوئے ساتھ میں موجود نائب وزیراعلیٰ برجیش پاٹھک۔

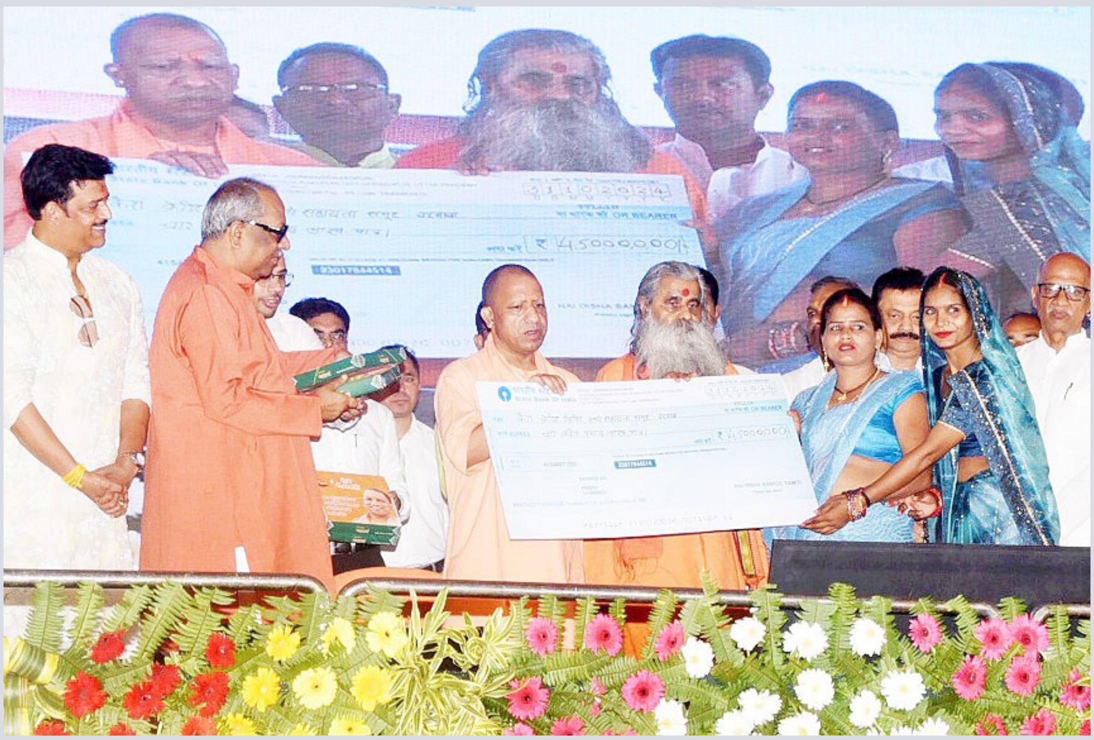

جناب وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ گورکھپور کے ونٹنگیا گاؤں میں دیوالی کے موقع پر ایک خاتون کو امدادی چیک دیتے ہوئے۔

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ	اپنی بات	۲

مضامین

پروفیسر فضل امام شخص اور شخصیت	پروفیسر فاروق بخشی	۳
سہیل نامہ۔کارنامہ	صبیحہ انور	۶
مالک رام کی خاکہ نگاری	ڈاکٹر علی حیدری	۸
سالک لکھنوی شخصیت کے آئینے میں تحریر	ڈاکٹر تمنا نسیم	۱۲
منشی بساون لال شاداںؔ اور اُمیر نامہ	ڈاکٹر راشد میاں	۱۴
پطرس بخاری: اردو کا نمائندہ طنز و مزاح نگار	ڈاکٹر احسان عالم	۱۷
میر غلام رسول نازکی کی شاعری پر اقبالؔ کے اثرات	جمشیدہ جہاں آرا	۲۰
فارسی زبان وادب اور راجہ رتن سنگھ زخمی	ڈاکٹر ناظر حسین	۲۲

منظومات

غزل	ڈاکٹر احمد منظور	۷
غزل	اسمل الہ آبادی	۱۱
غزل	ڈاکٹر جوہی بیگم شاما	۱۳
غزلیں	مخمور کاکوروی/فراز رضوی	۲۴
غزلیں	ڈاکٹر حمایت جائسی/ظفر اقبال ظفر	۲۵
غزلیں	سراج سکینہ/شاذیہ خان	۲۶
غزل	عرفان نجمی	۲۸

افسانے

مجھے یقین ہے کہ......	اشفاق برادر	۲۷
میری بیٹی	ڈاکٹر عبد الغفار فاروقی	۲۹

افسانچہ

کانچ کی گڑیا	عافیہ حمید	۳۱

ترقیات

اتر پردیش میں غریبوں کے لئے اپنا گھر	شاہد عباس	۳۲

جلد:78 شمارہ:03

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

جولائی ۲۰۲۳ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

پبلشر: ششر (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب انشمان ترپاٹھی (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ادارتی مشیر

محترمہ کُمکُم شرما (ڈپٹی ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

ریحان عباس

رابطہ: 9838931772

Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

نظارت: آسیہ خاتون، 9721856191

رابطہ برائے سرکولیشن وزر سالانہ:

صبا عرفی: 7705800953

تزئین کار: ایم. ایچ. ندوی

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ: ۱۸۰/روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اتر پردیش لکھنؤ 226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relations Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یارجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش لکھنؤ 226001

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

ماہنامہ نیا دور جولائی ۲۰۲۳ء کا شمارہ حاضر ہے۔

مجھے یہ بتاتے ہوئے بیحد خوشی محسوس ہو رہی ہے اب لکھنؤ والوں نے کتابوں کے تئیں اپنا شوق ظاہر کیا ہے، ہندی انگریزی کے ساتھ اردو کی کتابیں بھی لکھنؤ والوں کی پسند بن رہی ہیں، تہذیب کے شہر لکھنؤ میں کتابوں کی قدر دانی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تقریباً تین برسوں سے کتب میلہ کا انعقاد ماہ نومبر میں گومتی نگر واقع ریور فرنٹ پر بھارت سرکار کی نیشنل بک ٹرسٹ سوسائٹی (سنستھا) کی جانب سے منعقد کیا جاتا ہے۔ کتب میلہ کے انچارج سے اس بارے میں بات کی تو انہوں نے بتایا کہ اس کتب میلہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں بچوں کے لیے کریٹیو رائٹنگ، کہانی لکھنا، کامکس بنانے کے ساتھ نوجوانوں کے لیے کئی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر ایک مقابلہ جاتی اسٹیج بنایا جاتا ہے جس پر علم و ادب پر مختلف موضوعات، زاویوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بحث ومباحثہ کیا جاتا ہے، لکھنؤ کی تاریخ، گنگا جمنی تہذیب پر گفتگو کی جاتی ہے۔ اس اسٹیج سے مقامی و بیرونی، بین اقوامی سطح کے آرٹسٹ پروگرام پیش کرتے ہیں۔ اس کتب میلہ میں قریب ایک ہزار سے زائد ملک سے پبلشرز آتے ہیں جن کے ۱۵۰ سے زیادہ اسٹال لگائے جاتے ہیں۔

اس وقت سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اہل لکھنؤ زیادہ تر کتب سے جڑے ہوئے ہیں۔ کتب میلہ کے انچارج نے بتایا کہ لکھنؤ میں دو طرح کے ریڈرس گروپ ہیں۔ ایک انگلش اور دوسرا ہندی لٹریچر وار دولٹریچر۔ لکھنؤ کے لوگ پریم چند نرالا، بھگوتی چرن ورما کے ساتھ شعروشاعری والی کتابیں خوب خریدتے ہیں۔ پبلشرز بتاتے ہیں کہ لکھنؤ کے لوگوں کو جانکاری بہت ہے کیونکہ وہ کتابوں کو ڈھونڈھ کر پڑھتے ہیں۔ آج کے دور میں جہاں لوگ ڈجٹل سے جڑ رہے ہیں اور کتابوں سے دور ہو رہے ہیں ایسے میں لکھنؤ والے آج بھی کتابوں سے جڑے ہیں۔

لکھنؤ کے لوگ کتابوں کے اتنے شوقین ہیں اس بات کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ گذشتہ دنوں بلرام پور گارڈن میں لگے ۲۱ ویں نیشنل بک فیئر میں تقریباً ۵ ۷ لاکھ کتابیں کتب کے شوقین لوگوں نے خرید ڈالیں۔ لکھنؤ کے لوگ کتابوں کے صرف شوقین ہی نہیں ہیں بلکہ کتب کو لے کر اچھی سمجھ بھی رکھتے ہیں۔ اس بات کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بک فیئر میں ایک ہجوم سا لگا رہتا ہے۔

۹ نومبر سے ریور فرنٹ پر کتب میلہ کا آغاز ہو گیا۔ ۲۰۱۳ میں نیشنل بک فیئر میں ڈاکٹر اے پی جے ابوالکلام تشریف لائے تھے اس سال سب سے زیادہ کتابیں یعنی کہ دو کروڑ روپے کی کتابیں فروخت ہوئی تھیں۔ اس کے بعد کووڈ کے بعد جب بھی کہیں کوئی بک فیئر لگایا گیا تو پھر اس سطح کا مجمع میسر نہیں ہوا لیکن اب ایک بار پھر رونق نظر آنے لگی ہے، گذشتہ دو برسوں میں کتابوں سے شوق رکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اب تو کتب میلہ میں پوری فیملی آتی ہے۔ یہ بتاتے ہوئے بڑا فخر محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں نے کتابوں کی خریداری میں اپنا بھرپور تعاون پیش کرنا شروع کر دیا ہے جو اردو ادب کے لیے قابل تحسین ہے۔۔

ریحان عباس

یہ شمارہ جولائی ۲۰۲۳ء کا ہے جس کو نومبر ۲۰۲۴ء میں شائع کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر فاروق بخشی

فلیٹ نمبر ۱۰۷، ٹاور نمبر ۸، پروانچل رائل پارک، سیکٹر۔ ۱۳۷، نوئیڈا

9829808782

پروفیسر فضل امام شخص اور شخصیت

عصر حاضر کے ممتاز ادیب، نقاد، دانشور اور شاعر پروفیسر فضل امام رضوی بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ عرصۂ دراز سے صاحب فراش تھے اور علالت کے دور سے گزر رہے تھے۔ جو اس جہان فانی میں آیا ہے وہ یقیناً یہاں سے جائے گا اس سنگین حقیقت کے باوجود کئی شخصیتوں کا محفل جہاں سے یوں چلے جانا دلوں پر شاق گزرتا ہے۔ فضل امام صاحب جنہیں اب مرحوم لکھنا ہی پڑے گا ایسی شخصیات میں شامل تھے جن کے بغیر بزم علم و ادب عرصۂ دراز تک سونی سونی نظر آئے گی۔ ان کی تحریر ان کی تقریر اور ان کی بذلہ سنجی سے پر نکتہ سنجی ایسے اوصاف تھے جو ہر محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ ان کی باغ و بہار شخصیت اور ان کے نپے تلے تیز طرار جملے اچھے اچھوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیتے تھے جو ان کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی مگر فضل امام ہمیشہ اپنی کج کلاہی کے بھرم کو قائم رکھتے تھے۔ ترقی پسند فکر کے حامل تھے اور پھر جو شخص کربلا کو حرز جاں بنائے ہوئے ہو وہ حسین کے ساتھ ساتھ احتجاج اور انقلاب کو بھی سمجھتا ہے۔

میری ان کی پہلی ملاقات 1979 کی جاتی ہوئی سردیوں کے دنوں میں جے پور کے ایک مشاعرے میں ہوئی۔ میں ان دنوں اجمیر میں تھا۔ میرٹھ سے قبلہ حفیظ میرٹھی کا خط آیا کہ جے پور میں فلاں تاریخ کو مشاعرہ ہے۔ میں اجمیر آجاتا ہوں وہاں سے دونوں جے پور چلیں گے۔ حفیظ صاحب صبح سویرے اجمیر پہونچ گئے۔ دو پہر والی ٹرین سے ہم دونوں جے پور پہونچ گئے۔ رات کو مشاعرے میں میرٹھ کے پدم شری حکیم سیف الدین بھی مجلس صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ غالباً سیف صاحب کے ایک عزیز نصر بھائی مشاعرے کی انتظامیہ کمیٹی سے متعلق تھے۔ میرے ایک عزیز دوست اختر عادل جو شعبہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف میں انجینیر تھے ان دنوں وہیں تعینات تھے۔ معروف جدید شاعر ممتاز شکیب بھی وہاں آل انڈیا ریڈیو کے عہدے دار تھے اور میرٹھ ان کی سسرال تھا۔ یوں اس مشاعرے میں میرٹھ والوں کا بول بالا تھا۔ فضل امام صاحب کو وہیں پہلی مرتبہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھا بھی اور سنا بھی۔ آواز بڑی کڑک دار اور گھن گرج والی تھی، لہجہ کچھ پوربی انداز لیے ہوئے ضرور تھا مگر ذہن کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پتہ چلا ڈاکٹر فضل امام راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں صدر شعبہ ہیں۔ ہماری تو طالب علمی کا زمانہ تھا اور ہماری خو بو بھی فدویانہ تھی۔ اگلے روز ممتاز شکیب صاحب نے مجھے حفیظ میرٹھی اور فضل امام صاحب کو ریڈیو کی ادبی نشست کہکشاں کے لیے مدعو کرلیا۔ کیا تو وسیم بریلوی کو بھی تھا مگر انہیں کسی دوسرے مشاعرے کے لیے نکلنا تھا سو معذرت کرلی۔ فضل امام صاحب کا رویہ اپنے خوردوں کے ساتھ عام طور پر دوستانہ ہوا کرتا تھا۔ ممتاز شکیب یونیورسٹی میں ان کے طالب علم رہے تھے مگر یہ تعلق بے تکلف دوستی میں تبدیل ہوگیا تھا اور وہ شکیب صاحب کو بڑی بے تکلفی سے ''شکیبا'' کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ ریڈیو کی نشست کے بعد آکاش وانی کی کینٹین میں کافی کے لیے گئے۔ وہ اپنی گل افشانئ گفتار سے سب کو محظوظ کرتے رہے۔ میری طرف دیکھ کر کہنے لگے میاں اچھا پڑھتے ہو۔ میں سمجھ گیا یہ ایسی ہی تعریف تھی جیسے مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سن کر حالیؔ نے کہا تھا۔ میاں اچھا بول لیتے ہو۔ جی میں تو آئی کہہ دوں حضور اچھا کہنے کی کوشش بھی کرتا ہوں مگر خاموشی کو ہی اپنی عافیت جانا۔ کیونکہ میں آئندہ کے امکانات کو محدود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر تو ان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دسمبر 1980 میں دہلی منتقل ہوگیا تو وہ جب بھی دہلی آتے پہلے سے اپنی آمد سے مطلع کرتے اور میں ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوتا۔ دوسری اور یادگار ملاقات راشٹرپتی بھون کے مشاعرے میں ہوئی۔ گیانی ذیل سنگھ ان دنوں صدر جمہوریہ تھے۔ اردو ان کی زبان تھی۔ شعر و شاعری کے رسیا۔ مجھے دیکھتے ہی زور سے بولے ائے بخشی یہاں بھی! دم ہے بھئی دم ہے۔ مشاعرے میں انہوں نے اپنی پاٹ دار آواز میں کوئی نظم سنائی ان کا خطیبانہ انداز ذاکری کا تجربہ کل مجمع پر چھا گئے۔ اس دن میں نے ترنم سے غزل پڑھی۔ داد دیتے ہوئے بولے اچھی آواز ہے میں نے کہا امام صاحب

> ''انعام الحق صاحب کے انتقال کے بعد اب جے پور میں اردو کا ایسا شیدائی ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملے گا۔ فضل امام صاحب کی سرگرمی، سرکردگی اور سربراہی قدم قدم پر جلوہ گر ہو رہی تھی۔ سب ان کے حسن انتظام کی داد دے رہے تھے دوسرے دن شام کو تمام مہمان رخصت ہو گئے۔ ابن کنول اور ارتضیٰ کریم کہنے لگے ہم کل جائیں گے۔ آج تم ہمیں جے پور سیر کے لیے لے چلو۔ رات کا وقت تھا ہم سب پیدل ہی مرزا اسماعیل روڈ پر چلے جاتے تھے کہ سامنے سے شیروانی میں ملبوس ایک صاحب کو برقعہ پوش خاتون کے ساتھ ایک رکشا پر آتے ہوئے دیکھا۔ دل کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ دن میں جس شخص کو سوٹ اور ٹائی میں دیکھا تھا وہ اب رات کو شیروانی میں۔ رکشا قریب آیا تو یقین پختہ ہوا کہ فضل امام صاحب ہی ہیں۔ وہیں رکشا پر سے زور سے بولے ائے بخشی! دن میں ہوگئی ترقی پسندی، اب ہم مجلس میں جا رہے ہیں، حسین کی بارگاہ میں۔''

کبھی شعر کی تعریف بھی کیجئیے تو مسکرا کر رہ گئے ۔میں نے یہ واقعات اس لیے بیان کیے کہ زیادہ تر احباب ان کی شعری شخصیت سے نا آشنا ہیں بلکل ان کے استاد پروفیسر محمود الٰہی کی شخصیت کی طرح ۔کتنے لوگ واقف ہیں کہ وہ ایک زمانے میں محمود الٰہی زخمی ہوا کرتے تھے ۔ایک زمانے میں انہیں مشاعروں میں نظامت کرنے کا شوق ہوا۔اللہ نے شخصیت اور آواز میں دم دیا تھا اور سونے پر سہاگہ ان کے استاد بھائی ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اس میدان کے مرد کامل تھے ۔کچھ احباب کے اصرار پر وہ اس میدان میں بھی اتر آئے ۔میرٹھ، بلند شہر اور دوسرے کئی شہروں میں ہم نے بھی انہیں شاعر کے علاوہ بحیثیت ناظم بھی مدعو کیا۔ان دنوں لکھنؤ میں والی آسی نے کچھ پاکستانی شاعروں کے مجموعے شائع کیے تھے ۔شکیب جلالی ان کے پسندیدہ شاعر تھے ان کا تقریباً تمام مجموعہ انہیں ازبر تھا۔ دوران نظامت شکیب جلالی کے اشعار بے دریغ سنایا کرتے تھے ۔مگر دو چار مشاعروں کی نظامت کے بعد ہی انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ ذاکری الگ شعبہ ہے اور مشاعرے کی نظامت ایک بالکل ہی الگ دنیا ہے اس میں تحکم سے زیادہ تکلم کا کمال دکھانا ہوتا ہے اور سچ پوچھیے تو ان کے علمی و ادبی کاموں اور تنقیدی و تحقیقی کارناموں کے بوجھ تلے ان کا شاعر دبتا ہی چلا گیا۔ایسے ہی نا جانے کتنے نام ہیں آل احمد سرور، محمود الٰہی، قمر رئیس ۔۔اس لیے شاعری بقول گوپال متل پورے مرد کی متقاضی ہوتی ہے ۔

جنوری 1986 میں راجستھان ہائیر ایجوکیشن سروسز کے تحت میرا تقرر بحیثیت لیکچر رو ہاں ہوگیا۔میں نے انہیں خط لکھ کر مشورہ چاہا کہ مجھے راجستھان کے کس شہر کا انتخاب کرنا چاہیئے ۔ان کا تفصیلی جواب آیا لکھا کہ ویسے تو راجستھان کا ہر ذرہ اپنی مثال آپ ہے مگر آپ کے لیے کوٹہ بہتر رہے گا اس لیے کہ کوٹہ سے دہرہ دون ایکسپریس اور فرنٹیئر میل ہر دن میرٹھ کے لیے جاتی ہیں اور اس طرح تم اپنے والد کی خبر گیری کا فریضہ بھی ادا کرسکو گے ۔میں نے ان کے مشورے پر لبیک کہا اور کوٹہ کے پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو کو جوائن کرلیا۔ پورے چھبیس برس کوٹہ میں بسر ہوئے، پوری جوانی کوٹہ میں گزری مگر وطن مالوف سے بھی تعلق برقرار رہا۔فضل امام صاحب کا مشورہ بہت سود مند ثابت ہوا۔

1986 میں انجمن کل ہند ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کا سال تھا۔دہلی میں قمر رئیس صاحب کی سرپرستی میں سہ روزہ عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا ۔قمر رئیس صاحب کا خیال تھا کہ صوبائی انجمنوں کو بھی اپنے یہاں کانفرنسوں کا انعقاد کرنا چاہیئے ۔راجستھان انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کی جانب سے اس بار گراں کو اٹھانے کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لے لی۔وہ صوبائی شاخ کے صدر تھے ۔پروفیسر فیروز احمد جنرل سیکریٹری اور میں سیکریٹری ۔انہوں نے راجستھان کے تمام سرکردہ ادیبوں اور شاعروں کو انجمن ترقی پسند مصنفین سے جوڑ لیا تھا۔ 18,19 اکتوبر 1986 کو جے پور میں راجستھان انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔قمر رئیس صاحب کا حکم تھا کہ میں 17 اکتوبر کو ہی جے پور پہونچ جاؤں تا کہ فضل امام صاحب اور فیروز صاحب کا ہاتھ بٹا سکوں۔ میں مسلم مسافر خانے میں مقیم تھا۔جہاں اس زمانے میں راجستھان کے تمام ادباء وشعراء قیام کیا کرتے تھے،ایک طرح سے وہ راجستھان کے ادباء وشعرا کا میٹنگ پوائنٹ تھا۔قمر رئیس صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہم سب دہلی سے احمد آباد میل سے جے پور کے لیے روانہ ہوں گے ۔مجھے علم تھا کہ احمد آباد میل صبح سویرے جے پور پہونچ جاتی ہے ۔میں بروقت اسٹیشن پہونچ گیا مجھ سے پہلے وہاں پروفیسر فیروز احمد صاحب مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھے ۔دہلی سے قمر رئیس صاحب کے ہمراہ پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر صادق بھی ٹرین سے برآمد ہوئے ۔یہ قمر رئیس صاحب کا کمال تھا کہ وہ لوگوں کو جوڑنا جانتے تھے ۔ان کی شخصیت کی سادگی سب کا من موہ لیتی تھی۔ نوجوانوں میں ارتضیٰ کریم اور ابن کنول اور کئی دوسرے بھی آئے تھے ۔فیروز احمد صاحب کچھ متفکر سے تھے ۔استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ترقی پسندوں کی اس کانفرنس کے مخالفین نے شہر میں پمفلٹ بٹوائے ہیں اور یہ پرچار کیا جارہا ہے کہ منکرین خدا اور اسلام مخالف لوگوں کی کانفرنس ہے ان کا فکرمند ہونا بجا تھا۔تھوڑی دیر میں فضل امام صاحب بھی تشریف لے آئے دوران گفتگو انہوں نے تمام مسائل کو اپنے قہقہوں میں اڑا دیا۔بولتے وقت انہیں الفاظ دہرانے کی عادت تھی ۔کہنے لگے ہم کربلائی ہیں انقلاب کے جویا اور حسین کے پرستار ہیں ۔ہم کسی سے ڈرنے دبنے والے نہیں ہیں ۔ان کی دیکھ ریکھ میں دو روزہ یادگار کانفرنس منعقد ہوئی ۔تمام سرمائے کا بندوبست بھی انہوں نے کیا تھا۔اس کانفرنس میں مذکورہ بالا اصحاب کے علاوہ سردار جعفری جیسی عظیم المرتبت شخصیت بھی موجود تھی ۔علی احمد فاطمی، پروفیسر افصح ظفر، پروفیسر محمود الحسن بھی تشریف لائے تھے ۔راجستھان کے ادیبوں میں ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی، ڈاکٹر رفعت اختر خاں، سید معظم علی، ممتاز شکیب، ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، ڈاکٹر مدبر علی زیدی، ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی جے پور کی سرکردہ علمی اور ادبی شخصیت انعام الحق سے بھی ان کا یارانہ تھا اور اس کانفرنس میں انعام الحق صاحب نے بہت کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ کانفرنس کے تمام شرکاء اور مندوبین کی ضیافت کا اہتمام انعام الحق صاحب کی کوٹھی پر ہوا تھا۔جس میں کئی سو لوگوں نے شرکت کی تھی ۔رات کو ان کی کوٹھی کے وسیع صحن میں محفل مشاعرہ بھی سجائی گئی تھی ۔انعام الحق صاحب کے انتقال کے بعد اب جے پور میں اردو کا ایسا شیدائی ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملے گا۔فضل امام صاحب کی سرگرمی، سرکردگی اور سربراہی قدم قدم پر جلوہ گر ہو رہی تھی ۔ سب ان کے حسن انتظام کی داد دے رہے تھے دوسرے دن شام کو تمام مہمان رخصت ہو گئے ۔ ابن کنول اور ارتضیٰ کریم کہنے لگے ہم کل جائیں گے ۔آج تم ہمیں جے پور سیر کے لیے لے چلو۔رات کا وقت تھا ہم سب پیدل ہی مرزا اسماعیل روڈ پر چلے جاتے تھے کہ سامنے سے شیروانی میں ملبوس ایک صاحب کو برقعہ پوش خاتون کے ساتھ ایک رکشا پر آتے ہوئے دیکھا۔دل کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ دن میں جس شخص کو سوٹ اور ٹائی میں دیکھا تھا وہ اب رات کو شیروانی میں ۔رکشا قریب آیا تو یقین پختہ ہوا کہ فضل امام صاحب ہی ہیں ۔وہیں رکشا پر سے زور سے بولے ائے بخشی ! دن میں ہوگئی ترقی پسندی، اب ہم مجلس میں جارہے ہیں، حسین کی بارگاہ میں ۔یہ تھے ہمارے فضل امام صاحب ۔اسی سال انہوں نے الہٰ آباد کے لیے رخت سفر باندھا۔ وہاں پہلے ریڈر اور بعد میں پروفیسر مقرر ہوئے ۔مگر ان کی شخصیت پر جو بہار راجستھان کے صحراؤں میں آئی تھی وہ گنگا جمنا کے سرسبز وشاداب علاقوں میں میسر نہ ہوسکی ۔حالانکہ اتر پردیش ان کے بزرگوں کی سرزمین تھی بعد میں وہ اتر پردیش کے چیف منسٹر ملائم سنگھ سے قربت کے سبب اتر پردیش بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن کے چیرمین بھی مقرر ہوئے اور انہیں وزیر کا درجہ دیا گیا تھا۔لیکن ان کے جانے سے راجستھان ایک جوہر قابل سے محروم ہوگیا۔جس سے لوگوں کو بہت امیدیں تھیں ۔راجستھان یونیورسٹی کا شعبۂ اردو اور فارسی ان کے بعد اس ادبی گہما گہمی سے محروم ہوگیا جس کی ضرورت اردو والوں کے لیے از حد ضروری ہے ۔مگر راجستھان ان کے دل میں بسا ہوا تھا اس رشتے کو مزید مضبوط کرنے کے لیے انہوں نے اپنی ایک بیٹی کی شادی جے پور میں کی ۔ان کے داماد ڈاکٹر علی حسن بہت خوش مذاق اور قابل انسان ہیں ۔انگریزی ادب کے لیکچرر ہیں اور میرے حلقۂ احباب میں شامل ہیں ۔

پروفیسر فضل امام کی پیدائش ۷ اگست ۱۹۴۰ء کو ضلع اعظم گڈھ کے موضع بہاء الدین پور میں ہوئی تھی ۔یہ ایک علمی و ادبی خانوادہ تھا۔ان کے والد سید مشتاق حسین رضوی جو ریل کے محکمے میں ملازم تھے اردو و فارسی ادب سے واقفیت رکھتے تھے ۔ان کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق مدارس میں ہوئی ۔ایم اے کی ڈگری آگرہ یونیورسٹی سے حاصل کی ۔اور پی ایچ ۔ڈی کے لیے اردو کے نامور ادیب اور نقاد پروفیسر محمود الٰہی کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ قلم بند کیا۔ان کے مقالے کا موضوع امیر اللہ تسلیم حیات اور کارنامے تھا۔ایک تو محمود الٰہی جیسے صاحب فہم وفراست

کی نگرانی، دوم فضل امام جیسا زیرک ریسرچ اسکالر۔ اس تحقیقی مقالے نے جہاں امیر اللہ تسلیم کی شخصیت اور ان کے شعری محاسن کی بازیافت کی وہیں فضل امام صاحب کی قدروقیمت میں بھی اضافہ ہوا اور وہ ادبی حلقوں میں ایک بالغ نظر نقاد تسلیم کیے جانے لگے۔ اس کے بعد تو ان کے قلم سے ایک سے بڑھ کر ایک ادبی کارنامے منظر عام پر آئے جس کی بدولت ان کی شہرت میں اضافے کے ساتھ اردو کا دامن بھی ان کی علمی و ادبی فتوحات سے بھرنے لگا۔

مرحوم کی تدریسی زندگی کا آغاز بلرام پور مہاراجہ کی یاد میں قائم شدہ کالج سے ہوا۔ وہ وہاں کئی برس تک اردو زبان وادب کی تدریس سے وابستہ رہے۔ ان کی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی اس وقت آئی جب انہوں نے راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی سے وابستگی اختیار کرلی۔ راجستھان میں ان کا قیام دو دہائی سے کچھ کم برس تک رہا۔ مگر یہ عرصے ان کے لیے بھی اور اہل راجستھان کے لیے بھی اردو زبان وادب کی تدریس کے ساتھ ساتھ اس کی ترویج کے لیے بھی بہت سود مند ثابت ہوا۔ راجستھان میں ان کی آمد تازہ ہوا کے اس جھونکے کی طرح تھی جیسے پژمردہ کونپلوں میں جان پڑگئی ہو۔ راجستھان یونیورسٹی کی راہ داریاں اردو کے طلبہ وطالبات سے پر ہوگئیں۔ مذاکروں، مباحثوں، مشاعروں اور سمیناروں کی ایک نئی دنیا آباد ہوئی۔ 1986 کی گرمیوں میں انہیں الہ آباد یونیورسٹی سے بلاوا آیا اور وہ وہاں کے شعبۂ اردو میں پہلے ریڈر اور بعدہ پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں کے ادبی حلقوں میں بھی ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے ادیبوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر وہ چمک کہیں کھوگئی تھی جس کی بدولت راجستھان کے ادبی صحراؤں میں بہار آگئی تھی۔ اس ویران میکدے کا نصیبا بھی سنورنے لگا تھا، جو انہوں نے الہ آباد جا کر حاصل کیا دیر سویر وہ انہیں یہاں بھی حاصل ہو جاتا مگر کبھی فیصلوں کی نفسیاتی تہہ میں اترنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ حالانکہ جانے سے قبل وہ یہاں کے شعبۂ اردو و فارسی کو پوری طرح ایک مخصوص علمی و ادبی رنگ میں ڈھال چکے تھے۔ اداروں اور تنظیموں کی اہمیت اپنی جگہ مگر کبھی مرتبہ ان کی شناخت اشخاص سے ہوتی ہے۔ جے پور سے ان کے جانے کے بعد پروفیسر فیروز احمد نے بہت سنبھالا۔ تنقید وتحقیق کے میدان میں شعبے کی شناخت کل ہند سطح پر ہوئی۔ مگر پروفیسر فیروز احمد کی سبکدوشی کے بعد وہاں راہ داریاں سونی پڑی ہیں۔ یہی حال اودے پور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا ہے۔ جہاں پروفیسر ثاقب رضوی جیسا جید عالم شعبۂ اردو سے وابستہ تھا۔ صوبے کے پہلے وزیر اعلیٰ موہن لال سکھاڑیا بھی ان کے قدر دانوں میں تھے۔ وہ خوبصورت شہر اردو کی مٹھاس سے خالی سا ہوگیا ہے۔ یہی حال جے پور کا ہے۔ زیادہ لکھوں گا تو لوگ ناگواری کا احساس کریں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو والے اردو کے قاتل ہیں۔ بالخصوص اردو تدریس سے وابستہ افراد جو شعبہ ہائے اردو میں تعیناتی کے بعد خود کو خدا کا وارث سمجھنے لگتے ہیں اور طلبہ کے ساتھ غلاموں سے بھی بدتر سلوک روا رکھتے ہیں۔ مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں مگر مجھے کہنے دیجیے اکثریت ایسوں کی ہی ہے۔

شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد فضل امام صاحب لکھنؤ منتقل ہوگئے تھے۔ بہت پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ دمہ کا مرض تو انہیں پہلے سے تھا۔ شوگر کی زیادتی البتہ بہت پریشان کرتی تھی مگر ایسا کچھ نہیں تھا کہ یوں رخت سفر باندھ لیں گے۔ چند روز قبل ہی لکھنؤ کے کسی اسپتال میں داخل ہوئے اور کچھ روز کی علالت کے بعد ہی 13 اگست 2020 کو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اگست میں ہی وہ اس جہان فانی میں وارد ہوئے تھے اور اگست ہی میں اس دنیا کو خیرآباد کہہ دیا۔ کل اسی برس کی عمر پائی۔ اپنے پیچھے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں نیز نواسی اور نواسوں پر مشتمل ایک بھرا پرا خاندان چھوڑ گئے۔ رہے نام اللہ کا۔۔۔ اپنے ایک قطعہ میں انہوں نے خود ہی اعتراف کیا تھا۔

جانے والے کو کہیں روک سکا ہے کوئی
پھول برساؤ گے کیا آگ لگا کر جاؤ
مجھ سے مانگے نہ کہیں میری تمنا تجھ کو
اپنے دامن سے چراغوں کو بجھا کر جاؤ

پروفیسر فضل امام رضوی کے علمی وادبی کارناموں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ مگر ان کی جن تصانیف نے مجھے بے انتہا متاثر کیا ان میں امیر اللہ تسلیم پر تحریر کردہ ان کا تحقیقی مقالہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا طرز استدلال ان کے تحقیقی مرتبے کو بلند وبالا قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ ان کے اس تحقیقی کارنامے سے امیر اللہ تسلیم کی شخصیت اور کلام پر پڑا ہوا گرد وغبار اس طرح صاف ہوا کہ لوگ تسلیم کے مرتبے سے واقف ہوئے۔ ان کے اس کام کا اعتراف اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے نواز کر کیا۔ میر انیس کی شخصیت اور ان کے فن کے تعین قدر میں ان کا ڈی لٹ کا مقالہ انیس شخصیت اور فن بڑی قدر وقیمت کا حامل ہے۔ انہیں یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ راجستھان کے اردو والوں میں وہ پہلے ڈی لٹ ہیں۔ جوش ملیح آبادی پر ان کی تصنیف شاعر آخر الزماں ان کی جوش کے تئیں عقیدت کی مظہر بھی ہے اور عصر حاضر میں جوش شناسی کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے نزدیک بھوج پوری زبان وادب کا تعارف، تاریخ اور اردو سے اس کے لسانی رشتے کی اہمیت پر اس سے قبل اس طرح غور وفکر نہیں کیا گیا تھا۔ راجستھانی زبان وادب کی تاریخ لکھ کر انہوں نے دوسروں کے لیے راستہ ہموار کیا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ پروفیسر فیروز احمد کو راجستھان اور اردو کے لسانی روابط پر غور وفکر کرنے کی تحریک شاید ان کی اس تصنیف سے ہی ملی ہو۔ یقیناً پروفیسر فیروز احمد نے ایک ضخیم کتاب اس موضوع پر لکھ کر ماہرین لسانیات کو اردو کی ابتدا کے مختلف نظریات پر غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ پروفیسر فضل امام کے جانے سے راجستھان اور اتر پردیش دونوں صوبوں کے علمی وادبی حلقوں میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔

□□□

لکھنؤ ایجنسی

ماہ نامہ نیا دور کے وہ قارئین جو اس کے مستقل ممبر نہیں ہیں اگر وہ نیا دور کی خریداری کے خواستگار ہیں تو لکھنؤ میں ان مندرجہ ذیل ایجنسیوں سے رابطہ کریں۔

دانش محل:
امین آباد لکھنؤ۔ 9792361533

عرش پبلیکیشنز:
خواجہ ٹاور، وکٹوریہ اسٹریٹ، چوک لکھنؤ۔ 9935915110

صبیحہ انور

نامی پریس بلڈنگ، نخاس لکھنؤ

9839132270

سہیل نامہ۔ کارنامہ

سہیل کاکوروی ایک اسم با مسمی شخصیت کا نام ہے۔ سہیل ستارہ ہے رات کے اندھیرے میں روشنی کا پیامبر۔ چھوٹے بڑے دسیوں ستارے چمک رہے ہیں۔ (پہلے آسمان پر سیکڑوں ہوا کرتے تھے میں نے گننے کی بھی کوشش کی ہے) ۔ اگر آپ آسمان پر غور سے نظریں جمائیں تو رات جتنی بھی اندھیری ہو آپ کہیں نہ کہیں ایک منّا سا ستارہ ڈھونڈ لیں گے۔ جو دھیرے دھیرے پلکیں جھپکاتا جاگتا نظر آتا ہے۔ اس کو دیر تک دیکھئے اور پھر وہ ستارہ شوق سے ہمک کر زیادہ بلکہ سب سے زیادہ چمک اٹھتا ہے۔ اور اپنی دھیمی دھیمی چمک سے توجہ بانٹتا رہتا ہے۔ میرا یہ بیان شاید آپ کو شاعرانہ لگے مگر سہیل جنہیں آپ ہم سب سہیل کاکوروی کہتے ہیں ان پر یہ بیان پورا ترتا ہے۔ میں نے سہیل کو ان کے بچپن سے دیکھا ہے۔ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں اور میں نے ہمیشہ ان کو اپنے سے چھوٹا سمجھا ہے۔ ان کے والد معین الدین حسن صاحب امیر الدولہ اسلامیہ کالج میں انگریزی کے لکچرر تھے اور اس سے پہلے میرے والد وجاہت علی سندیلوی صاحب کے دوست تھے۔ کرشچیئن کالج میں والد سے سینئر تھے۔ میری دادی کا انتقال والد کی نو عمری میں ہو گیا تھا، سات بڑی بہنوں کے اکلوتے بھائی والد کے حد سے زیادہ دلارے اور لاڈلے تھے۔ لکھنؤ میں معین صاحب خود بخود دوست سے زیادہ والد کے انچارج بن گئے۔ والد صاحب جنھیں میں میاں جان کہتی بتاتے تھے کہ معین صاحب کی اپنے گھر میں بے حد قدر و منزلت تھی۔ وہ بھی اپنی خاندان کی چہیتی اولاد تھے۔ لیکن اگر میاں جان معین صاحب کے گھر پہونچ جائیں تو معین صاحب پکار کر گھر میں اطلاع کر دیتے ”امی وجاہت آئے ہیں“۔ گھر والوں کے لئے یہ ایک خبر تھی کہ وہ وجاہت کے لئے شربت اور دوسرے لوازمات تیار کریں۔ انتہا یہ تھی کہ کالج میں امتحان کے دوران معین چچا ہسٹری کے چیپٹر با آواز بلند پڑھتے کہ وجاہت سن لیں۔ وجاہت آنکھ بند کر سنتے رہتے۔ معین صاحب چیک کر لیتے کہ وجاہت سو تو نہیں گئے۔ میاں جان کی بے پروائی پر ناراض بھی ہوتے۔ میرے والد ایک لبرل، آزاد خیال مذہبی اور مسلکی آویزشوں سے آزاد نوجوان تھے۔ یہ آزادگی آخر عمر تک برقرار رہی۔ ان کی بحثوں اور باتوں پر معین صاحب با آواز بلند دعائیں کرتے۔

”اے اللہ اسے معاف کر دینا یہ بڑا معصوم اور نیک بندہ ہے۔ تھوڑا سا باغی مزاج ہے تو اس پر رحم کرنا اسے معاف کر دینا“۔ معین چچا ہم سے کہتے ”تمہارا باپ ہمارا پرانا دشمن ہے۔ بہت عاجز کیا۔ زندگی ضیق کر دی تھی“۔

اس زمانے میں صلیبی جنگوں سے متعلق انگریزی فلمیں مے فیئر سنیما ہال میں حضرت گنج میں لگتی تھیں۔ مے فیئر کا ماحول خاصہ انگریزی اور پاش تھا۔ دیکھنے والے زیادہ تر گورے اور ٹامی ہوتے۔ ماحول بہت شائستہ ہوتا۔ سب دوست معین صاحب کو بیچ میں بٹھاتے اور خاموش رہنے کی تاکید کرتے رہتے مگر کیا مجال کہ فلم کے دوران معین صاحب ایک آدھ بار اللہ اکبر اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کا نعرہ نہ لگائیں۔ سنیما کے اہل کار اندھیرے میں لپکتے۔ ہر بار معین صاحب سے وعدہ لیا جاتا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کریں گے۔ ایک مشہور فلم صلاح الدین ایوبی کے کسی جنگی معرکے کے بارے میں تھی۔ عرصے سے اخباروں میں اور شہر میں اس فلم کا چرچا تھا۔ سب دوستوں نے فلم کا پروگرام بنایا بس معین صاحب کا ساتھ ہونا اور سنبھالنا ٹیڑھی کھیر تھا۔ سب جانتے تھے کہ صلاح الدین ایوبی معین صاحب کی کمزوری ہے۔ معین صاحب کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ مگر جیسے ہی بڑے پردے پر اونچے گھوڑے پر سوار ہوتے شاندار اسلحوں سے سجے ایک مرد مومن کو لے کر چھلانگ لگائی۔ معین صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ سیٹ پر کھڑے ہو کر نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دئے۔ جوش ایمانی اپنے عروج پر تھا جو بھی روکتا اس کی خیر نہیں تھی۔ آواز رندھی ہوئی تھی۔ نتیجے میں پوری ٹولی سنیما ہال سے باہر کر دی گئی۔ سب دوست مے فیئر کے برامدے میں شرمندگی کا پسینہ پونچھ رہے تھے۔ سب نے طے کر لیا کہ اب ان کے ساتھ کبھی فلم نہیں دیکھیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگلی بار فلم دیوداس دیکھنے گئے تو جیب میں دو رومال لے کر گئے۔ دوستوں کو تاکید تھی کہ رومال ضرور رکھ لینا۔

> ”سہیل کاکوروی اور ان کی کتاب سہیل نامہ پر بات کرتے کرتے ان کے والد کی بات کرنے لگی، کیونکہ میں نے سہیل کو اسی مخلص، دردمند اور مددگار ہستی کے حوالے سے ہی جانا تھا۔ اس وقت سے جب سہیل اپنے والدین کے صاف ستھرے میاں پوت بن کر جاتے رہتے معین صاحب کالج کی چھٹیوں میں سندیلے اپنی بیگم اور بیٹے کے ساتھ تشریف لاتے۔ سہیل میں محبت، رفاقت اور دردمندی کے اجزا مدتے باگل گشستم کا ہی نتیجہ ہیں۔ مخلص، ملنسار اور منکسر المزاج سہیل نے اس حوالے کو اسی طرح برقرار رکھا ہے، مہینوں ملاقات نہیں ہوتی مگر جب ملتے ہیں تو اسی گرم جوشی سے کہ خود اپنی کوتاہیوں پر شرم آتی ہے۔ ہر بات بڑی سعادت مندی سے سنتے ہیں۔ سردیوں میں ملے تو سردی میں نہ گھومنے کی تاکید کر دی۔ اگر گرمیوں میں فون آیا تو ”باہر نہ نکلنا گھر میں بیٹھو دھوپ بہت تیز ہے“ کی نصیحت کر دی۔ انھوں نے سر جھکا کر سن لی۔ نرمی اور شائستگی سہیل کی طبیعت کا خاصہ ہے۔“

سہیل کاکوروی اوران کی کتاب سہیل نامہ پر بات کرتے کرتے ان کے والد کی بات کرنے لگی، کیونکہ میں نے سہیل کو اسی مخلص، دردمند اور مددگار ہستی کے حوالے سے ہی جانا تھا۔ اس وقت سے جب سہیل اپنے والدین کے صاف ستھرے میاں پوت بن کر جاتے رہتے معین صاحب کالج کی چھٹیوں میں سندیلے اپنی بیگم اور بیٹے کے ساتھ تشریف لاتے۔ سہیل میں محبت، رفاقت اور دردمندی کے اجزا مدتے باگل شستم کا ہی نتیجہ ہیں۔ مخلص، ملنسار اور منکسر المزاج سہیل نے اس حوالے کو اسی طرح برقرار رکھا ہے، مہینوں ملاقات نہیں ہوتی مگر جب ملتے ہیں تو اسی گرم جوشی سے کہ خود اپنی کوتاہیوں پر شرم آتی ہے۔ ہر بات بڑی سعادت مندی سے سنتے ہیں۔ سردیوں میں ملے تو سردی میں نہ گھومنے کی تاکید کردی۔ اگر گرمیوں میں فون آیا تو ”باہر نہ نکلنا گھر میں بیٹھو دھوپ بہت تیز ہے“ کی نصیحت کردی۔ انھوں نے سر جھکا کر سن لی۔ نرمی اور شائستگی سہیل کی طبیعت کا خاصہ ہے۔

یہ میں نے کہیں اور بھی لکھا ہے کہ انسان پر مختلف اوقات میں طاری ہونے والی کیفیات میں بہت اہم اور ضروری کیفیت حیرت کی ہے۔ اگر ہم پر طاری ہماری کیفیات سے حیرت کو ہٹا دیا جائے تو یہ دنیا بے مزہ، اندھیری اور سنسان ہو جائے گی۔ حیرت زندگی کو وہ رنگارنگی دیتی ہے جو ہمیں زندہ رکھتی ہے۔ سہیل نے ہمیں کئی بار حیرت زدہ کیا ہے۔ ندرت طبع اور جدت خیالی سہیل کو سہیل بناتی ہے۔ دانتوں تلے انگلی دبانے والی کراماتی خوبی سہیل کو سب سے الگ کرتی ہے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے نئے نکتے دماغ میں آتے ہیں۔ یوں تو سہیل کی تقریباً بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے میں کئی کتابیں عجیب وغیرب خوبیوں سے مزین ہیں۔ آم نامہ۔ آم پر تقریباً سات سو اشعار پر مشتمل کتاب ہے۔ 2015 میں آم نامہ لمکا بک آف رکارڈس میں شامل ہے۔ روزمرہ اور محاوروں پر چھ سو اشعار لکھے گئے ہیں۔ محاورے اور ضرب المثل جو ہماری بول چال سے ختم ہو رہے ہیں ان کو خوبصورتی سے اشعار میں پرو کر سہیل نے ایک تہذیبی کارنامہ انجام دے دیا ہے۔

”نیلا چاند“ یا پھر ”تشکیل نو“ غالب کی زمین میں ”ارضیات غالب“ اس کے بعد سہیل نامہ منظوم خودنوشت سہیل کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ خودنوشت لکھنا اور پھر منظوم!! جہاں گزری بیتی زندگی کو دہرانا، یادوں کے بے پناہ سیلاب کو ضابطے میں لانا اور بیان کرنا بہت مشکل رہا ہوگا۔ شاید ان کی ہشت پہل سرشت انہیں ایک جگہ قرار سے بیٹھنے نہیں دیتی ہے۔ یہ سہیل کی محبت ہے کہ سردی کے کڑکڑاتے موسم میں سہیل خود مجھے کتاب دینے آئے۔ غیر افسانوی تحریروں میں خودنوشت میری پہلی پسند ہے، اس سے مجھے خصوصی دلچسپی ہے۔ سہیل نامہ بھی میں نے ذوق وشوق سے پڑھا۔ سہیل نامہ سہیل کی سادگی، انکساری، وسیع القلبی کی داستان ہے۔ جو کسی تعارف یا حوالے کی محتاج نہیں۔ اس میں نہ نمائش ہے نہ ریاکاری نہ خودپسندی نہ قد کو اونچا کرنے والی بیساکھیاں، نہ اپنے شاندار اور پرشکوہ پس منظر کا سہارا لیا ہے، نہ ہی اپنی بشری کمزوریوں اور نادانیوں کو چھپانے کا عذر۔ اپنے خوف اور جھجھک کے وقت قلندر صفت درویش سرشت سہیل کو آر پار دیکھا جاسکتا ہے۔

خودنوشت میں سچائی سب سے مشکل کسوٹی ہے۔ چونکہ تحریر کا تانا بانا جن کے گرد بنا جاتا ہے اور جو بُنتا ہے دونوں ایک ہوتے ہیں اور ڈنڈی مارنے کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر لکھنے والا خودنوشت لکھنے کی جسارت نہیں کرتا۔ کیونکہ اکثر دیانت دار حقیقت کو افسانہ نہیں بناتے۔ کبھی کبھی ہمارا طرز فکر اور تہذیبی حصار جگہ جگہ حائل ہوتا ہے۔ سہیل نے بڑی ایمانداری اور بہادری کے ساتھ زندگی کی بند مٹھی کھول دی ہے۔ فن کے حوالے سے اتنا ضرور کہوں گی کہ خوشبو، رنگ تشبیہیں استعارے کی دوسری اصناف میں گنجائش ہے۔ زندگی کی مربوط روداد کو قلم بند کرکے یہ تمام فنی لطافتیں طاق پر رکھنا پڑتی ہیں۔ یہاں بیان کی رنگینی ممکن نہیں۔

یہ صاف گوئی سے لکھی گئی تحریر ہے: یقین ہے کہ سہیل نامہ کا شمار لکھنؤ کی تہذیبی تاریخی دستاویزات میں ہوگا۔ لکھنؤ والوں کی ایسی رواداری جذباتی ہم آہنگی کی یہ ایک مثال ہوگا۔ یہ ایک ایسا تہذیبی مرقع ہے جو کسی مصور کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا جو حیرت کے ساتھ ساتھ اہل لکھنؤ اور کاکوری شریف کے لئے باعث فخر ہوگا۔

❑❑❑

غزل

راحتِ دل دعا دے آج مجھے
راس آئے کوئی علاج مجھے

خیریت پوچھتا تو کیا ہوتا
چبھ رہا ہے ترا مزاج مجھے

میری کوشش صلاح کی پابند
تُو سکھاتا ہے احتجاج مجھے

عشق تیری ادائیگی کیا ہے
کھا رہا ہے ترا خراج مجھے

بیچ کر سب جسے خرید لیا
بیچ آیا وہی رواج مجھے

کل تماشا میں اس کا دیکھوں گا
جس نے سمجھا مذاق آج مجھے

میں اندھیروں کا پاس دار نہیں
جانتے ہیں سبھی سراج مجھے

غم گساروں نے دے دیا منظور
زخم سینے کا کام کاج مجھے

ڈاکٹر احمد منظور
چندسمہ بارہ ملا کشمیر
7006345309

ڈاکٹر علی حیدری

موضع و پوسٹ مگرسن، ضلع پریاگ راج

8417802059

مالک رام کی خاکہ نگاری

نام مالک رام بو یجہ، قلمی نام ''ناتھ رام'' جس کو ماہر القادری نے تجویز کیا تھا۔ پیدائش ضلع گجرات (پاکستان) کے قصبہ پھالیہ میں ۲۲؍ دسمبر ۱۹۰۶ء کو کھتری خاندان میں ہوئی۔ والد کا نام لالہ نہال چند تھا جو اپنے بھائیوں بہنوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ اور انگریزی حکومت میں فوج کے محکمۂ کمشنریٹ میں ملازم تھے۔ والدہ کا نام بھگوان دیوی تھا جو بہت نیک سیرت اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد اپنی زندگی کے آخری ایام تک یہ مالک رام کے ساتھ رہیں۔

مالک رام کی ابتدائی تعلیم سکھوں کے گرودوارہ میں ہوئی۔ جہاں انھوں نے استاد گرنتھی جگت سنگھ سے گورمکھی، پنجابی لکھنا پڑھنا سیکھا اور سکھ مذہب کے مقدس بانیوں جیسے جپ جی، کیرتن، راہ راس، سکھ منی، سوہلا وغیرہ کا مطالعہ کیا اور اس کو ہمیشہ کے لئے حفظ کر لیا۔ گرودوارہ میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا کوئی بندوبست نہ تھا اس لئے ان کی ماں نے اپریل ۱۹۱۲ء میں ان کو ورنا کیولر مڈل اسکول پھالیہ میں داخل کرایا جہاں سے ۱۹۲۰ء میں انھوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وکٹوریہ ڈائمنڈ جبلی ہائی اسکول وزیر آباد ضلع گجرانوالہ سے ۱۹۲۲ء میں جونیئر اور سینئر اسپیشل امتحان پاس کیا اور اسی اسکول سے ۱۹۲۴ء میں ہائی اسکول کیا۔ پھر ۱۹۲۶ء میں گجرات گورنمنٹ انٹر کالج سے انٹر فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس کے بعد ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور سے ۱۹۲۸ء میں بی۔ اے بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۳۰ء میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اتفاق سے اسی سال پنجاب یونیورسٹی نے ملازم پیشہ لوگوں کے لئے کالج میں وکالت کی تعلیم دینے کے لئے ایوننگ کلاسیز کھول دیئے۔ جس کا فائدہ اٹھا کر مالک رام نے اسی کالج سے ۱۹۳۳ء میں وکالت کی ڈگری حاصل کر لی۔ جب کہ وکالت کا پیشہ کبھی اختیار نہیں کیا محض علم میں اضافے کے مقصد سے ڈگری حاصل کی تھی۔ مالک رام نے اپنی ملازمت کا آغاز ماہ نامہ ''نیرنگ خیال'' کے نائب مدیر کی حیثیت سے کیا۔ جہاں انھوں نے اپنی تندمزاجی و محنت سے کام کیا جس کے نتیجہ میں ان کو ساٹھ روپیہ ماہانہ ملتا تھا۔ ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک یہ ''نیرنگ خیال'' کی ادارت سے وابستہ رہے۔ اسی ملازمت کے دوران آریہ پرادیشک پرتیندھی سبھا کا ہفت روزہ اخبار ''آریہ گزٹ'' لاہور سے بھی وابستہ ہو گئے۔ یہاں بھی ان کو ساٹھ روپیہ ماہانہ ملنے لگا۔

آریہ گزٹ سے استعفیٰ دینے کے بعد ۱۹۳۵ء میں ایک ماہ ریڈیو دہلی میں کام کیا۔ پھر جنوری ۱۹۳۶ء میں روزنامہ ''بھارت ماتا'' سے وابستہ ہوئے جہاں ان کی تنخواہ ۷۵ روپئے ماہانہ مقرر کی گئی تھی۔ اس اخبار میں چھ ماہ کی مدت تک ہی کام کرنے پائے تھے کہ یہ اخبار بھی بند ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو ذریعہ معاش کے لئے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ چنانچہ جون ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء تک عارضی طور پر حکومت ہند کے پبلک انفارمیشن بیورو اور پولیٹکل ڈپارمنٹ میں ملازمت کرتے رہے۔ بیورو کی ملازمت ختم ہونے کے بعد جالندھر کی ایک فرم سالک رام بندرابن میں سو روپیہ ماہانہ پر ملازمت کر لی۔ لیکن یہاں ان کا دل زیادہ دنوں تک نہیں لگا اور انھوں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ پھر اس کے بعد ایک اگست ۱۹۳۹ء کو ٹریڈ کمشنر آفس (Trade Commissioner Office) اسکندریہ (مصر) میں سپرنٹنڈنٹ (Superintendent) کا چارج لیا۔ اس میں ان کا تقرر تین سال کے لئے کیا گیا تھا لیکن دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے ان کی تقرری میں اضافہ ہوتا رہا اور اس طرح یہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک اپنے عہدے پر فائز رہے۔ ملک آزاد ہونے کے بعد حکومت ہند نے انڈین فارن سروس (I. F. S) کی تشکیل کی اور مصر کے قاہرہ میں ہندوستانی سفارت خانہ کھولا گیا اس سفارت خانہ کے شعبۂ تجارت میں بحیثیت سپرنٹنڈنٹ مالک رام نے ۱۹۴۹ء تک اپنے خدمات کو بخوبی انجام دیا۔ مالک رام کے اس کام سے سفارت خانے کے افسران بہت خوش و مطمئن تھے۔ اس لئے انہوں نے مالک رام کو سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ترقی دے کر سکریٹری شعبۂ تجارت مقرر کر کے ۱۹۵۰ء میں ہندوستانی سفارت خانہ بغداد (عراق) بھیج دیا۔ جہاں انہوں نے ۱۹۵۱ء تک اپنے خدمات انجام دیئے۔

> ''مالک رام نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز رابندر ناتھ ٹیگور کی شاہکار تصنیف ''گیتا نجلی'' کے ایک ٹکڑے کا سلیس اردو نثر میں ترجمہ کر کے کیا۔ جو ۱۹۲۴ء میں ''نیرنگ خیال'' لاہور کے کسی شمارے میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا تقابلی مضمون ''ذوق و غالب'' کے عنوان سے لکھا جو ستمبر ۱۹۲۶ء میں ''نگار'' کے شمارے میں شائع ہوا۔ پھر عبدالرحمن بجنوری کے انگریزی مضمون ''اسرار خودی'' و ''رموز بے خودی'' کا ترجمہ مع حواشی کے ''مثنویات اقبال'' کے عنوان سے کیا جو ۱۹۳۲ء میں ''نیرنگ خیال'' کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔ غالب کا فارسی شعری مجموعہ ''سبد چین'' کو نئے سرے سے ترتیب دیا جو ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔ غالب کی سوانح عمری پر ایک کتاب ''ذکر غالب'' کے عنوان سے لکھی یہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی۔''

۱۹۵۲ء کے اوائل میں وہ بغداد سے دہلی آئے اور یہاں سمرنا (ازمیر) کے آفس میں دو برس تک کام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء کے آخر میں ان کو قائم مقام ٹریڈ کمشنر بنا کر دوبارہ اسکندریہ (مصر) بھیجا گیا۔ پھر اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ان کا تبادلہ وزارت خارجہ دہلی میں کر دیا گیا جہاں یہ کنٹرولر آف امپورٹس کی حیثیت سے ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک رہے۔ حکومت ہند نے قاہرہ میں ایک ٹریڈ سینٹر کھولا تھا جہاں ہندوستانی مصنوعات کی نمائش لگائی جاتی تھی۔ اس ٹریڈ سینٹر میں مالک رام کو حکومت ہند نے ڈپٹی ڈائرکٹر بنا کر بھیجا جہاں پر یہ ۱۹۶۰ء تک اپنے فرائض کو انجام دیتے رہے۔ پھر حکومت ہند نے ان کا تبادلہ بحیثیت سکریٹری تجارت سفارت خانہ بلجیم میں کر دیا۔ یہاں پر انھوں نے مارچ ۱۹۶۴ء تک اپنی خدمات کو انجام دیا پھر اپریل ؍ ۱۹۶۴ء میں ٹرانسفر ہو کر وزارت خارجہ حکومت ہند نئی دہلی آگئے اور اسی وزارت میں کام کرتے ہوئے مارچ ۱۹۶۵ء میں باعزت رٹائر ہوئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جو اس وقت ساہتیہ اکادمی دہلی میں صدر تھے جب ان کو پتہ چلا کہ مالک رام سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں تو انھوں نے مالک رام کو اسی دن ایڈیٹر اردو شیکشن (ساہتیہ اکادمی دہلی) مقرر کر لیا جہاں پر انھوں نے مالک رام کو مولانا ابو الکلام آزاد کی تصانیف کی ترتیب و تدوین کا کام ان کے سپرد کیا جس کو مالک رام نہایت عقلمندی سے کرتے رہے اور پھر ۳ سال بعد ۱۹۶۸ء میں استعفیٰ دے کر دہلی کی ایک مشہور لمیٹیڈ کمپنی ”جالندھر موٹر ایجنسی“ میں ”مینجنگ ڈائریکٹر“ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کمپنی میں مینجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے اردو تحقیق کو فروغ دینے والا سہ ماہی رسالہ ”تحریر“ کے اعزازی مدیر کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ اور جب ۱۹۷۸ء میں یہ رسالہ نکلنا بند ہوا تو اپنی ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو گئے۔ مالک رام پوری زندگی ملازمت اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ پیری نے کب دستک دے دی ان کو پتہ ہی نہ چلا۔ کافی دیر تک مسلسل کام کرنے کی وجہ سے ان کے پیروں میں ورم آجاتا تھا اور دل کا عارضہ تو ان کو پہلے ہی لگ چکا تھا۔ کئی بار دورے بھی پڑے لیکن علاج سے ٹھیک ہو جاتے تھے۔ مارچ ۱۹۹۳ء کے آخری ہفتے میں ان کو نزلہ، بخار اور سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی۔ جب سانس میں گھٹن اور بڑھتی گئی تو ان کو ”مول چند اسپتال“ میں بھرتی کرایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے بہتر سے بہتر علاج کیا لیکن ان کی حالت اور خراب ہوتی گئی۔ آخرکار ۱۷؍اپریل ۱۹۹۳ء کو ”مول چند اسپتال“ نئی دہلی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے جسد خاکی کو لودھی روڈ شمشان گھاٹ میں نذر آتش کر دیا گیا۔

مالک رام نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز رابندر ناتھ ٹیگور کی شاہکار تصنیف ”گیتا نجلی“ کے ایک ٹکڑے کا سلیس اردو نثر میں ترجمہ کر کے کیا۔ جو ۱۹۲۴ء میں ”نیرنگ خیال“ لاہور کے کسی شمارے میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا تقابلی مضمون ”ذوق و غالب“ کے عنوان سے لکھا جو ستمبر ۱۹۲۶ء میں ”نگار“ کے شمارے میں شائع ہوا۔ پھر عبدالرحمن بجنوری کے انگریزی مضمون ”اسرار خودی“ و ”رموز بے خودی“ کا ترجمہ مع حواشی کے ”مثنویات اقبال“ کے عنوان سے کیا جو ۱۹۳۲ء میں ”نیرنگ خیال“ کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔ غالب کا فارسی شعری مجموعہ ”سبد چین“ کو نئے سرے سے ترتیب دیا جو ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔ غالب کی سوانح عمری پر ایک کتاب ”ذکر غالب“ کے عنوان سے لکھی یہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ مالک رام نے ”تذکرۂ معاصرین“ (چار جلد)، ”تلامذۂ غالب“، ”ایرانی شہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال“، ”فسانۂ غالب“، ”گفتار غالب“، ”تذکرۂ ماہ و سال“، ”عورت اور اسلامی تعلیمی“، ”قدیم دلی کالج“ وغیرہ بیش تر کتابیں تخلیق کیں۔ مالک رام اردو کے مشہور محقق و ماہر غالبیات اور بے شمار کتابوں کے تخلیق کار ہی نہیں بلکہ ایک نامور خاکہ نگار بھی ہیں۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ”وہ صورتیں الٰہی“ ۱۹۷۴ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی سے شائع ہوا۔ جو دس خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل خاکے مندرجہ ذیل ہیں۔ غالب، سائل دہلوی، صدر یار جنگ، (مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی) سید سلیمان ندوی، برج موہن دتاتریہ کیفی، یاس یگانہ چنگیزی، جگر مراد آبادی، نیاز اور نیاز مند، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر وغیرہ۔ اس مجموعے کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالک رام نے خاکہ نگاری کے فنی تقاضوں کو مدنظر رکھ ایک بہترین خاکہ لکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مجموعے میں شامل پہلا خاکہ ”مرزا غالبؔ“ مالک رام کے تخیل، تحقیق اور تخلیق کا بہترین نمونہ ہے۔ جب کہ یہ خاکہ غالبؔ کی وفات کے تقریباً سو سال بعد لکھا گیا ہے۔ اس خاکے میں مالک رام اپنے تخیل اور صیغۂ واحد متکلم کی تکنیک استعمال کر کے غالب کے ہمعصر بن گئے ہیں۔ اور اپنے تخیل کے سہارے غالب سے چند ملاقاتیں کر کے ان کے ابتدائی زمانے سے لے کر ان کی وفات تک کے تمام حالات و واقعات کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس طرح غالب کے عادات و اطوار، نشست و برخاست کے انداز، روزمرہ کے معمولات، ان کی خانگی زندگی اور دربار سے ربط ضبط، دوست احباب کی صحبت، ان کی پسند اور ناپسند اشیاء، ان کی صورت و سیرت، اعزہ و اقارب سے تعلقات، ان کے جسم کو گھلا دینے والی بیماریوں کی وضاحت، غرض ہر اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے جس سے غالب کی ہو بہو جیتی جاگتی تصویر قاری کے نظروں کے سامنے ابھر سکے۔ اسی طرح غالب کی شکل و صورت اور حلیہ کی تصویر کتنے دلچسپ انداز میں کھینچی ہے ملاحظہ کیجئے:

> ”میرزا صاحب کا سن پچاس سے اوپر تھا۔ چوڑا چکلا ہاڑ، داڑھی صفاچٹ، نازک باریک مونچھیں جنھیں تاؤ دے رکھا تھا، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، سرخ و سپید رنگ، جس میں چمپئی دمک تھی، سر پر لمبے لمبے پٹھے، قلموں پر لٹکتے ہوئے بال، سر پر ایک پلے کی ہلکی سی ٹوپی جس پر کشیدہ کا کام تھا۔ بدن پر تزیب کا انگرکھا، اور نیچے ایک برکا سپید پاجامہ۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ ہاتھ میں پیچوان کی سٹک تھی اور کش لگا رہے تھے“۔[۱]

مالک رام کو قلمی چہرہ اور حلیہ پیش کرنے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ اتنے تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ صاحب خاکہ سے بالکل، اجنبیت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شخصیت سے بڑی پرانی جان پہچان ہو گویا اس سے مل چکے ہوں۔ ان کی یہ خوبی اور کمال ان تمام ادبی شخصیتوں میں دیکھنے کو مل جاتی ہے جن کا خاکہ انھوں نے خود رقم کیا۔ اپنے خاکے ”سائل دہلوی“ میں نواب سراج الدین احمد خاں کی ایسی جاذب تصویر کھینچی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر کسی کیمرے سے لی گئی ہو۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ”زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ داخل ہوئے۔ تقریباً ستر برس کا سن، کوئی پونے چھ فٹ کا قد، کمر میں خفیف سا خم۔ میدہ و شہاب کی ملی جلی رنگت، ملبوترا کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، اونچی کاٹھی کی لمبی عقابی قسم کی نوکدار ناک، کلے کی ہڈیاں نمایاں طور پر ابھری ہوئی۔ سڈول جسم، سنہری جھلک مارتی ہوئی سپید ڈاڑھی، جو ایک مشت تو یقیناً تھی، دو انگشت کی خدا جانے شرعی لبیں، آنکھیں نسبتاً چھوٹی لمبے لبے بازو اور ہاتھ پاؤں۔ سر پر ہلکی سی پلے کی ٹوپی، جس کے نیچے سے لمبے لمبے کھچڑی بال نکلے پڑتے تھے۔ گلے میں کاج پٹی گریبان اور کھلی آستینوں کا ململ کا کرتہ، کندھے پر رومال، نیچے لٹھے کا آڑا پاجامہ۔ پاؤں میں خورد نوک کا جوتا۔ دائیں ہاتھ میں لکڑی اور بائیں میں سگریٹ کا بکس اور دیاسلائی کی ڈبیا“۔[۲]

مالک رام صرف صورت و حلیہ بیان کرنے میں ہی قدرت نہیں رکھتے۔ بلکہ جس شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے سلسلے میں کوئی بات ادھوری نہیں چھوڑتے اتنے تفصیل سے ہر بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ کہیں بھی قاری کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتا۔ اگر شخصیت ادیب یا فن کار ہے تو اس کا پورا شجرہ کھنگال لیتے ہیں اور اس کے پورے خاندان کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں خاکہ ''سائل دہلوی'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں نواب سراج الدین احمد خان کے پورے خاندان کا شجرہ بیان کیا ہے:

> ''یہ تھے نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی بن نواب شہاب الدین احمد خان ثاقب بن نواب ضیاء الدین خان بہادر نیر رخشاںؔ بن فخر الدولہ نواب احمد بخش خان بہادر (والیِ فیروز پور جھرکہ و لوہار) بن مرزا عارف جان بخارائی۔''[۳]

مالک رام شجرہ نگاری کے ساتھ ساتھ جزئیات نگاری پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ہر موقع و واقع کا بیان بڑی تفصیل سے کرتے ہیں۔ کوئی بھی جز ان کی نظر سے بچ نہیں سکتا۔ اپنے تخیلی خاکے ''میرزا غالب'' میں غالب کے ناشتے اور کھانے کا بیان اتنے دلکش انداز میں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب ناشتہ کر رہے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں اور ہم انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جبکہ مالک رام نے غالب پر یہ خاکہ غالب کی وفات کے سو سال بعد لکھا۔ لیکن اندازِ بیان کی انوکھی تکنیک کا استعمال کر کے وہ غالب کے ہمعصر بن گئے ہیں اور قاری کو کسی بھی موقع پر یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ غالب کے ہمعصر نہیں رہے ہیں۔ غالب کے ناشتے اور کھانے کا منظر ملاحظہ کیجئے:

> ''تھوڑی دیر میں وفادار ملازمہ اندر سے سرپوش ڈھکا ہوا ایک لوٹا اور دو خالی گلاس لائی، اور انھیں قالین کے پاس رکھ کے چلی گئی۔ میرزا صاحب نے مجھ سے پوچھا: کیوں بھائی، حصہ کرو گے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ کیا ہے کہنے لگے: بادام اور مصری، کوئی حرام چیز نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک زمانہ سے مجھے گرمی کی شکایت ہے۔ حکیم صاحب نے کہہ رکھا ہے کہ رات کو پندرہ ایک بادام پانی میں بھگو دو۔ صبح چھلکا اتار کر انھیں خوب گھونٹ لو اور اس شیرہ میں گلاس بھر مصری کا شربت ملا کر پی جاؤ۔ چنانچہ گرمی ہو کہ جاڑا۔ روزانہ صبح نہار منہ، یہ ٹھنڈا پانی پیتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے دن بھر طبیعت میں تازگی اور فرحت محسوس کرتا ہوں۔ اس تبرید کے لئے مصری خاص طور پر بیکانیر سے منگواتا ہوں کہ وہاں کی مصری صاف اور خشک اور مٹھاس میں خوب ہوتی ہے۔ یہاں جو مصری بازار میں ملتی ہے اس میں نمی ہوتی ہے۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ اندر سے نیاز علی نے آ کر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے، حکم ہو تو نکلوایا جائے۔ اس پر دوستوں نے اجازت چاہی اور میرزا صاحب اور میں دونوں بچوں کے ساتھ اندر گئے۔ اندر ایک دالان میں فرش پر دسترخوان بچھا تھا۔ کھانے میں بھنا ہوا گوشت تھا۔ قیمہ بھرے کریلے تھے۔ بریانی پلاؤ تھا اور ایک ترکاری تھی۔ روے کا حلوہ تھا۔ دو تین قسم کا سرکے اور تیل کا اچار تھا۔ لیکن ایک بات عجیب دیکھی کہ قیمے اور گوشت ترکاری سب میں چنے کی دال پڑی ہے، دلمے میں کم اور گوشت ترکاری میں زیادہ میرزا صاحب نے ترکاری کو تو ہاتھ بھی نہیں لگایا، دو ایک نوالے کریلے کے ساتھ کھائے، تھوڑے سے چاول بھی چکھے۔ البتہ گوشت بہت رغبت سے کھایا اور کافی مقدار میں کھایا۔''[۴]

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ پر مالک رام کا لکھا ہوا خاکہ اتنا دلچسپ اور اسلوب اتنا انوکھا ہے کہ اردو میں اس کی کوئی مثال نہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر صابرہ سعید رقم طراز ہیں کہ:

> ''غالب پر ان کا خاکہ محض تخیل اور مکاشفہ کا کرشمہ نہیں ہے۔ انھوں نے غالب کی اور غالب پر لکھی ہوئی تمام تحریروں کا مطالعہ کیا۔ لوہارو خاندان کے بڑے بوڑھوں سے معلومات حاصل کی، اپنی تہذیبی بصیرت اور نفسیات انسانی کے مشاہدے کے سہارے غالب کی شخصیت اور زندگی کا خاکہ ایسے کمال کے ساتھ پیش کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ برسوں غالب کے ساتھ رہ چکے ہیں اور ان کے وظائف شب و روز کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ شخصی خاکہ نگاری میں یہ ایک نیا اور کامیاب تجربہ ہے۔''[۵]

مالک رام جزئیات نگاری میں معراج کمال پر تھے۔ شخصیت سے متعلق ہر چیز کا بیان بڑی وضاحت سے کرتے ہیں۔ چاہے وہ روزمرہ کے معمولات ہوں یا رہن سہن کے انداز ہوں ہر چیز کی تصویر بڑی مکمل اور صاف ستھری پیش کرتے ہیں۔ اپنے خاکے ''سائل دہلوی'' میں سائل صاحب کے گھر کے اندر کا نقشہ ایسا کھینچا ہے کہ ان کی پوری شخصیت جلوہ گر ہو اٹھتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''میں ملازم کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کے ڈیوڑھی میں آیا۔ یہاں اندر گھستے ہی دائیں طرف ایک چھوٹی سی کوٹھری یقینا ملازم کے لئے تھی۔ اسی طرف کے کونے میں اوپر جانے کا زینہ تھا۔ سامنے کے رخ پر ایک دروازہ تھا، جس پر پردہ پڑا تھا۔ یہ گھر کے صحن میں کھلتا تھا۔ پیش طاق پر ایک تختی لگی تھی، جس پر لکھا تھا: مکان لاڈلی بیگم۔ اسے دیکھ کر مجھے معاً ''حویلی علی نقی خاں بہادر کی'' والا لطیفہ یاد آگیا۔ الٹے ہاتھ کی بغل میں بیٹھنے کا کمرہ تھا۔ جس میں داخل ہونے کے لئے دو سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ ملازم نے کرمے کا دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھا کے خود نواب صاحب کی خدمت میں اطلاع دینے چلا گیا۔ میں نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی، تو دیکھا کہ وہاں اچھا خاصا مشرقی اور مغربی تمدن کا امتزاج ہو رہا ہے۔ یعنی کمرے میں دری کا فرش تھا، اس کے اوپر نصف کمرے کے لگ بھگ سفید براق چاندنی بچھی تھی۔ صدر میں ایک چھوٹا سا ایرانی قالین اور دو بڑے بڑے گاؤ تکئے لگے رکھے تھے۔ نشست کے قریب چاندی کا پاندان، پیچوان اور لگن، دو تین اگالدان اور سگرٹ کی راکھ جھاڑنے کی پیالیاں دھری تھیں۔ اور جہاں چاندنی نہیں تھی، وہاں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی رکھی تھی۔''[۶]

مالک رام کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ جس شخصیت کی مرقع کشی کرتے ہیں وہ اپنے عہد و ماحول کے ساتھ جاگ اٹھتی ہے۔ اور قاری تھوڑی دیر کے لئے اپنے اردگرد کے ماحول و حالات سے بے خبر ہو کر ماضی کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اسے آزادی کے پہلے کا ہندوستان اور اس عہد کی سیاسی و سماجی سرگرمیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ماضی کی باز آفرینی کا اصل کمال ان کے خاکے ''میرزا غالب'' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں پہ یہ قاری کو غالب کے عہد کی دلی، اس

زمانے کے سیر تماشے، لال قلعہ، جامع مسجد، پتنگ بازی کے میلے، جمنا کا کنارہ، بلی ماروں کا محلہ، کالے صاحب کی حویلی اور محل سرا کی سیر کراتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"میرزا صاحب نے جامع مسجد کی سیڑھیوں سے پالکی واپس کردی اور ہم پیدل سیر کرنے لگے۔ ایک ہنگامہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کہیں بازیگر اپنے کرتب دکھا رہا ہے، یا لوگ اس کے گرد پرا باندھے کھڑے ہیں۔ کہیں بھان متی کا تماشا ہو رہا ہے، اور یہاں بھی ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف، خوانچہ والے طرح طرح کی بولیاں بول رہے ہیں۔ سیڑھیوں پر ہر طرح کی دکانیں سج رہی ہیں۔ چلتے چلتے مرزا صاحب ایک جگہ رک گئے، اور کلیان سے کہا، جاؤ کلن کی دکان سے رات کے لئے چار آنے کے سیخ کے کباب لے آؤ۔ وہ دونے میں کباب رکھوا لایا۔ میں نے راستے میں ایک جگہ سے دو تین کتابیں خریدیں اور میرزا صاحب نے بچوں کے لئے کچھ کھلونے اور مٹھائی خریدی۔ واپسی میں چاندنی چوک کے راستے سے ٹہلتے ہوئے آئے۔ سعادت خان کی نہر سڑک کے بیچوں بیچ تھی۔ دورویہ درختوں کی قطار اور دکانوں کی روشنی کا، پانی میں عکس، عجیب پرلطف نظارہ تھا۔ دن بھر کی گرمی سے طبیعت جتنی گھبرائی ہوئی تھی، اتنی ہی اس وقت شام کی سہانی فضا میں محظوظ ہوئی۔ سینکڑوں آدمی نہر کے کنارے بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔"[7]

مالک رام نے اپنے تمام خاکوں میں ہر جگہ غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ جو شخصیت جس چیز کی حامل تھی اسے ہو بہو ویسا ہی پیش کیا ہے۔ نہ بے وجہ کسی کی مدح سرائی کی اور نہ ہجو۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی شخصیت خوبیوں کی حامل تھی تو ان کی خوبیوں کو ظاہر کیا اس کے برعکس سید سلیمان ندوی کی شخصی خامی پر کہیں بھی پردہ نہیں ڈالا بلکہ غیر جانبدارانہ طور پر اس کو پیش کیا لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ ان کی عظمت پر کہیں بھی حرف نہ آنے پائے۔

مالک رام کے خاکوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات صاف طور سے واضح ہے کہ ایک خاکہ نگار کے اندر جو فنی خوبیاں ہونی چاہئے وہ سب مالک رام کے پاس ہیں ان کی تحریر بڑی سادہ شگفتہ اور رواں ہے کہیں بھی مرصع کاری کا عکس نظر نہیں آتا۔ ہر سطر میں معنویت اور دلکشی نظر آتی ہے۔ زبان کا استعمال ٹھیٹ اور معتدل انداز میں کیا ہے۔ اسلوب ان کا جداگانہ ہے۔ واقعات اور تاثرات کا خاص توازن ان کے اندر پایا جاتا ہے۔ آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خاکہ نگاری کے فنی تقاضوں کو زیر نظر رکھ مالک رام نے جتنے بھی خاکے لکھے وہ سب صنف خاکہ نگاری میں ایک بیش قیمتی اضافہ ہیں۔ اور اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں مالک رام کو بحیثیت خاکہ نگار زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

حواشی:

۱۔ مالک رام، "وہ صورتیں الٰہی"، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۷۶ء ص ۱۴، ۱۵
۲۔ ایضاً ص ۵۲
۳۔ ایضاً ص ۵۲
۴۔ ایضاً ص ۱۸، ۱۹، ۲۰
۵۔ ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو ادب میں نئی خاکہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۷ء ص ۱۶۲
۶۔ مالک رام، "وہ صورتیں الٰہی"، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۷۶ء ص ۵۱
۷۔ ایضاً ص ۲۷

□□□

غزل

ایک ایسی کتاب لکھوں گا
خاموشی بے حساب لکھوں گا

زندگی سے ملے ہیں جتنے غم
سارے غم کا حساب لکھوں گا

میں ستایا ہوا زمانے کا
ساری دنیا خراب لکھوں گا

وہ ملا اور میں تباہ ہوا
اس کا ملنا عذاب لکھوں گا

اس کی تصویر سامنے رکھ کر
اس کا حسن و شباب لکھوں گا

ایسی قاتل تباہ کُن آنکھیں
اس کی آنکھیں شراب لکھوں گا

عمر بھر جس کی پردہ پوشی کی
اب اسے بے نقاب لکھوں گا

بے بسی بے حساب آملؔ کی
ابھی کچھ اور باب لکھوں گا

آملؔ الٰہ آبادی
الٰہ آباد، یوپی
8208589570

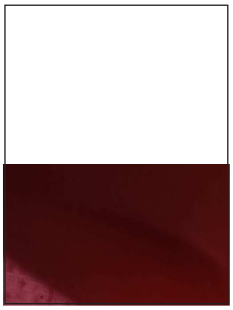

ڈاکٹر تمنا نسیم

اسسٹنٹ

8820414403

سالک لکھنوی شخصیت کے آئینے میں تحریر

سالک لکھنوی کثیر الجہات شخصیت اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ ہر دم فعال رہنے والے انسان تھے-وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر' نقاد' افسانہ نگار' ایک کامیاب شارح' مبصر' مترجم' سماجی کارکن اور بہترین صحافی بھی تھے۔شرافت اور مروت انکی ذات گرامی کی خاص خوبیاں ہیں جو نئی نسل کے لئے مشعل راہ کی حثیت رکھتی ہیں-عمر کے ابتدائی ایام میں تمام آشائشوں سے محروم رہنے والے انسان کی حیثیت سے سالک صاحب نے کبھی اپنے عزم پر حالات کو حاوی ہونے نہیں دیا- سالک لکھنوی کی تصویر اگر کوئی شخص اپنے تخیل کی مدد سے بنانا چاہے تو اس کے ذہن میں روایتی شاعروں کا خاکہ آئے گا-مثلاً شیروانی میں ملبوس' سر پر اونچی ٹوپی' دراز گیسو وغیرہ-لیکن ایسا بالکل نہیں ہے-ان کے ہم عصروں سے پتہ چلا جنھوں نے جب انہیں دیکھا تو انکی واضع قطع کچھ اس طرح سے تھی گوری رنگت چمکدار آنکھیں ان پر عینک' کشادہ پیشانی جس پر گفت وشنید کے وقت کی بل پڑتے تھے۔میانہ قد ہلکی مونچھ متناسب ہونٹ دھیما لہجہ قید و بند اٹھانے والے ایک سیاستداں اور اپنی ذات میں خود ایک جیتی جاگتی انجمن بھی رہ چکے تھے۔انکی شخصیت بڑی پہلو دار اور پرکشش نظر آتی ہے-سالک صاحب کی سماجی وادبی خدمات کی وجہ سے انکی شخصیت ہیرے کی مانند آج بھی چمکتی ہے-سالک صاحب یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ کے قدیم ممبر تھے۔اسی زمانے میں انکی سیکریٹری شب میں سی-ایم او-ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا-اس سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ اسکول کے ابتدائی دو مہینوں میں اساتذہ اور دیگر اسٹاف کی تنخواہیں انہوں نے اپنی جیب خاص سے دیں۔ بہتوں کو اردو آنرز ایم-اے اور پی ایچ ڈی کی تیاری میں انہوں نے گائیڈ کیا-ہمشہ حاجت مندوں کی ضروریات کا خیال رکھا-انکی فیاضی کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے ڈیڑھ لاکھ روپئے کی کتابیں مع الماری مغربی بنگال اردو اکاڈمی کو عنایت کردیں-ایک صحافی کی حیثیت سے اگر سالک صاحب پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ انہوں نے نہ صرف معیاری اور مثبت صحافت کا نمونہ پیش کیا-بلکہ ادب اور صحافت کو قریب تر لانے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے افسانے مضامین ترجمے طنز و مزاح گو بیشتر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور عمدہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں-عزرا اور دیگر افسانے (1941ء) پس شعر (1981ء) بے سروپا (طنزیہ ومزاحیہ، مضامین کا مجموعہ (1982ء) بنگال میں اردو نثر کی تاریخ آغاز تا حال (1998ء) ترجمہ کامریڈ مظفر احمد حیات وخدمات (1983ء) سالک لکھنوی کی ادبی وسماجی خدمات کی وجہ سے انہیں بہت سارے ایوارڈ سے نوازا گیا-ایوارڈ:-1) جوش ملیح آبادی مغربی بنگال اردو اکاڈمی (1984ء) 2) فریڈم فائیٹر ایوارڈ کلکتہ یونیورسٹی 3) پیش فورم سند اعزاز کلکتہ (1985ء) 4) پدم شری ایوارڈ (2013ء) بعد مرگ (5 کل ہند پرویز شاہدی ایوارڈ مغربی بنگال اردو اکاڈمی (2002ء) اس میں کوئی شک نہیں کہ سالک صاحب اخلاص ومحبت کا پیکر تھے۔انکے لہجے میں لکھنو کی جھلک ملتی ہے-وہ اپنے احباب کا بڑا حلقہ رکھتے تھے-اپنے حلقے میں مہمان نوازی کے لئے بھی مشہور تھے۔باہر سے آنے والے اکثر و بیشتر شعراء حضرات انکی مہمان نوازی سے لطف اٹھا چکے ہیں-جو شخص ان کے یہاں ایک دفعہ طعام وقیام کرلے وہ دوسری دفعہ آنے کی خواہش ضرور ظاہر کرتا تھا۔اسکی وجہ صرف سالک صاحب کا بلند پایہ اخلاق تھا کہ کوئی بھی انکی دعوت قبول کرنے سے انکار نہیں کرتا شعر وادب کی بے شمار محفلیں پاؤں میں پڑی سیاہ زنجیر یا سر پر لہراتی ناڈ کی تلوار بھی خوفزدہ کم ہی کرتی ہے-برطانوی دور حکومت میں بھی یہی بے باکانہ بلکہ اس سے زیادہ مجرمانہ انداز جینے کا تھا۔18 ماہ کی سزا بھی ہوئی تھی۔مگر قیدی کی شرافت وجاہت دیکھ کر انگریز بہادر نے بعد میں سزا کی میعار کم کردی تھی۔لکھنؤ کو سالک صاحب نے خیر باد کہا تھا تو صرف زبان ساتھ نہ تھی وہاں کی تہذیب وضع داری رواداری شرافت اور نفاست وغیرہ کو بھی جسم وجاں کی طرح ساتھ رکھا تھا۔آسمان نے پلٹے کھائے زمینیں بٹ گئیں دلوں کے ٹکڑے ہوگئے-آمین آباد کے آداب ورسوم گومتی کی لہروں کے ساتھ بہہ گئے مگر سالک صاحب کہ کلکتہ جیسے صنعتی وآہنگی شہر میں بھی لکھنوی تہذیب کو امانت سمجھ کر سینے سے لگا رکھا-

”سالک لکھنوی کو حادثوں سے کھیلنے کی ایسی عادات تھی ان کا انداز بیان کافی دلکش اور دلنشیں تھا دوران گفتگو ان کے لبوں پر ہلکا سا تبسم سجا رہتا جس سے سامنے والا شخص متاثر ہو جاتا تھا۔دوران گفتگو آنکھیں کبھی پھیل جاتیں اور موضوع کو بااثر بنانے کے لئے چہرے پر اس طرح لاتے جیسے الفاظ کے ساتھ روح روشن بھی نک وودو کر رہا ہو-لہجے میں زور ہوتا لیکن غصے کا شائبہ تک نہیں رہتا-سالک لکھنوی کے اس دلنشین انداز گفتگو کی ایک بڑی وجہ لکھنو کی نفاست شائستگی نرم مزاجی اور شریں کلامی تھی۔سالک لکھنوی ایک بھولے بھالے شریف آدمی تھے-جس کو انسان ہونا میسر تھا-مسلمانوں سے ہمدردی بہت تھی۔مگر ہندوؤں سے نفرت ذرا بھی نہیں کرتے تھے-انسان میں تفریق کرنے والے نظریات سے انہیں نفرت تھی۔ ہر انسان کو بلا تفریق مذہب وملت انسان سمجھا اور پیار بھری نظروں سے دیکھا-انکی نظر میں کسی شخص کا کسی مذہب سے وابستہ ہونا ایک الگ بات تھی۔وہ انسانیت کی نظر سے دیکھتے تھے-“

پرائیویٹ لائف کا سلسلہ تو خیر پرائیویٹ لوگوں سے ملتا ہے ان کے گھر پر منعقد ہوئیں- برسوں بزمِ احباب کا دفتر وہیں رہا اور بزم کے بہت سارے حلقے وہاں ہوئے- باہر سے آنے والے اکابر عصر کے لئے انکا گھر ایک قسم کی زیارت گاہ تھا۔ سیاسی رہنماؤں میں محمد علی جناح' پنڈت جواہر لال نہرو' کامریڈ جیوتی باسو' مشاہیر علم و ادب میں آل احمد سرور سجاد ظہیر' کیفی اعظمی' خلیق انجم وغیرہ جب بھی کلکتہ آتے سالک صاحب کے مہمان ہوتے اور اکثر انکے گھر پر قیام کرتے- سالک صاحب کے طریق سلوک سے جو لوگ واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ موصوف دریا سا دل رکھتے ہیں- ایک زمانہ تھا۔ جب کوئی دو نمبر سوتر کن اسٹریٹ کی چھت کے تلے طرہ سکتا تھا۔ شرط بس یہی تھی کہ آدمی باذوق ہو- سالک صاحب عادتاً اور فطرتاً سخی آدمی ہیں- آپ بڑے دل گردے اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے- حالات موسم حادثات مخالفین اور بیماریوں سے ساری زندگی ڈٹ کر مقابلہ کیا- بڑھتی ہوئی عمر بھی انکا کچھ نہیں بگاڑ سکی- روزمرہ کے غموں کی کھرونچ بھی انکے چہرے پر کوئی نشان نہیں چھوڑ سکی- ہمشہ انہوں نے اپنے آپ کو زندگی کے ہنگاموں میں مشغول رکھا- سالک لکھنوی کے کم وبیش بہت سارے معاصرین تھے۔

جن میں پرویز شاہدی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، فراق گورکھپوری، علقمہ شبلی، عصمت چغتائی، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، مظفر حنفی انکے علاوہ بھی بہت سارے شعراء و ادباء کے ساتھ انکے تعلقات تھے۔

سالک لکھنوی کو حادثوں سے کھیلنے کی ایسی عادات تھی ان کا انداز بیان کافی دلکش اور دلنشیں تھا دوران گفتگو انکی لبوں پر ہلکا سا تبسم سجا رہتا جس سے سامنے والا شخص متاثر ہو جاتا تھا۔ دوران گفتگو آنکھیں کبھی پھیل جاتیں اور موضوع کو با اثر بنانے کے لئے چہرے پر اس طرح لاتے جیسے الفاظ کے ساتھ روح روشن بھی نک و دود کر رہا ہو- لہجے میں زور ہوتا لیکن غصے کا شائبہ تک نہیں رہتا- سالک لکھنوی کے اس دلنشین انداز گفتگو کی ایک بڑی وجہ لکھنو کی نفاست شائستگی نرم مزاجی اور شریں کلامی تھی۔ سالک لکھنوی ایک بھولے بھالے شریف آدمی تھے- جس کو انسان ہونا میسر تھا- مسلمانوں سے ہمدردی بہت تھی۔ مگر ہندوؤں سے نفرت ذرا بھی نہیں کرتے تھے- انسان میں تفریق کرنے والے نظریات سے انہیں نفرت تھی۔ ہر انسان کو بلاتفریق مذہب وملت انسان سمجھا اور پیار بھری نظروں سے دیکھا- انکی نظر میں کسی شخص کا کسی مذہب سے وابستہ ہونا ایک الگ بات تھی۔ وہ انسانیت کی نظر سے دیکھتے تھے- انہوں نے جہاں ادب میں شاعر ادیب نقاد صحافی کے بطور شناخت بنائی وہی انہوں نے اپنے اعمال و اخلاص کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی- سادگی انکساری، وضع داری، صبر و تحمل غرض کہ ہر مرحلے کو انہوں نے اس خوبی سے انجام دیا جیسے وہ پوری زندگی اسی کے منتظر و مشتاق رہے ہو- غرض یہ کہ انکی پوری زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہے- سالک صاحب نے اپنی زندگی سے ہمیں بتانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی جیو تو شخص بن کر نہیں بلکہ شخصیت بن کر جیو کیونکہ شخص تو مر جاتا ہے پر شخصیت ہمشہ زندہ رہتی ہے- مگر پبلک لائف میں وہ بڑے مہذب اور وضع دار تھے۔ وضع داری اوپر سے اوڑھ لینے والی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ پشتینی اثاثہ ہوا کرتی ہے۔ وہ ایک پیڑھی اس اثاثہ کے امانت دار ہو تب یہ اندر کی چیز بنتی اور تب جا کر سالک جیسی مہذب اور وضع دار شخصیت سے اس کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ سالک لکھنوی کو اگر عہد ساز شخصیت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو ایک مقصد کے تحت گزارا انکی زندگی مسلسل نیک نفسی اخلاص و شرافت و پابندی اصول وضوابط فروغ قومی یکجہتی ملی و سماجی خدمات احباب نوازی اور ادبی ذوق وشوق کے پیش نظر تصنیف و تالیف اور فکر سخن میں گزری۔

سالک صاحب کو کئی زبانوں کا علم تھا لیکن اس جامعیت اور وسعت نظر کے باوجود بہت ہی سادہ مزاج انسان تھے۔ علمیت کا غرور بالکل نہیں تھا- چھوٹے بڑے ہر ایک کی بات کو نہایت ہی توجہ سے سنا اور مشفقانہ انداز میں جواب دینا سالک صاحب کا شیوہ بن چکا تھا- سالک صاحب بہت ہی مخلص نواز تھے۔

صرف شاعروں اور ادیبوں کی یہی عام غریبوں اور ضرورت مندوں کی تن من دھن سے مدد کرتے تھے اگرچہ ثروت ہیں سیاست اور سماج صحافت اور ادب غرض ہر میدان میں ممتاز حثیت رکھتے تھے۔ لیکن انتہائی منکسر المزاج تھے۔ ہر شخص سے برابری کی سطح پر ملتے اپنے بزرگوں اور ہم عصروں کا احترام اور چھوٹوں کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ مخاطب کی سطح پر اتر کر گفتگو کرتے تھے۔

❑❑❑

غزل

یہ ہے ایسا ستمگر جس کی من مانی نہیں جاتی
کروں کیا میں دل ناداں کی نادانی نہیں جاتی

تری بزم طرب میں چار سو خوشیوں کا موسم ہے
مگر کیا بات ہے کیوں دل کی ویرانی نہیں جاتی

تعجب ہے شب ہجراں اسے جتنا تراشوں میں
نہیں جاتی تری زلفوں کی طولانی نہیں جاتی

فلک کے چاند تاروں کو مسخر کر لیا ہم نے
مگر اس دہر سے انساں کی ارزانی نہیں جاتی

کٹی ہے عمر یوں تو خود فراموشی کے عالم میں
ستم گر کیوں تری یادوں کی طغیانی نہیں جاتی

تن نازک ہے شرمندہ یہ کیسی بے حجابی ہے
تو ہے ملبوس لیکن تیری عریانی نہیں جاتی

ہوئی مدت وہ شاماؔ بھول بیٹھا ہے مجھے یکسر
مری آنکھوں سے اب بھی اشک افشانی نہیں جاتی

ڈاکٹر جوہی بیگم شاماؔ
پریاگ راج، یوپی
7985982665

ڈاکٹر راشد میاں

شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، ٹونک

7240302056

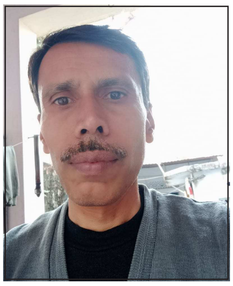

منشی بساون لال شاداںؔ اور 'امیر نامہ'

(ریاست ٹونک کے اوّلین غیر مسلم شاعر اور ادیب)

اردو زبان و ادب کی ترویج و فروغ اور نشر و اشاعت میں ملک ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مذاہب کے لوگوں کی شمولیت رہی ہے۔ اردو کے دو مرکزی دبستان دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ حیدر آباد، رام پور و بھوپال کے ساتھ ریاست ٹونک کی ادبی خدمات بھی قابل احترام رہی ہیں۔ یہاں کے فرماں رواؤں نے بلا تفریق مذہب و ملّت اہل علم حضرات کی سرپرستی و اعانت فرما کر اپنی علم دوستی و ادب نوازی کی جو نظیریں پیش کی ہیں اس کی مثالیں ملک میں بہت کم دیکھنے کو ملیں گے۔

اگرچہ ملک میں غیر مسلم و غیر اہلِ زبان بالخصوص ہندو مصنفین نے اردو سے متعلق جو تصنیفی و طباعتی خدمات انجام دی ہیں، اُن میں سے بیشتر انتہائی مہتم بالشان ہیں۔ طباعتی خدمات کے اعتبار سے دیکھیں تو منشی نول کشور کی خدمات سنہرے الفاظ میں لکھے جانے کی مستحق ہیں۔ اگر اُن کی خدمات نہ ہوتیں تو بلا شبہ ہمارے کئی قدیم مدارس و اسکول اپنی بنیادی کتابوں کی تعلیم و تدریس سے محروم ہوتے۔ ناواقف حضرات کے لئے یہ بات بھی تعجب خیز ہو سکتی ہے کہ فارسی زبان کا پہلا اخبار ایران کے بجائے ہندوستان میں کلکتہ سے راجہ رام موہن رائے نے جاری کیا تھا۔ اردو ادب ابتداء ہی سے غیر مسلم حضرات کا مرہونِ منت رہا ہے۔ اولاً ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور فورٹ ولیم کالج میں اُن کے رفقاء کے سبب اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ اردو پر خونِ جگر صرف کرنے والے غیر مسلم ادیب و شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ برج نارائن چکبستؔ ہوں کہ رتن ناتھ سرشارؔ، وتاتریہ کیفیؔ ہوں خواہ فراقؔ گورکھپوری، پریم چند، مالک رام، حکیم چند نیرؔ، گیان چند، کالی داس گپتا رضا اور گوپی چند نارنگ وغیرہ جیسے محسنین اردو کی ادبی خدمات کے سبب آج اردو ایک بڑے اور بیش قیمتی ذخیرے سے مالا مال ہے۔

ادبی خدمات کے سبب راجستھان کا لکھنؤ کہلانے والی ریاست ٹونک کے غیر مسلم مصنفین کی شعری و ادبی کاوشیں بھی اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ ریاست میں شعر و ادب کی نشو و نما اور ترویج و فروغ کے اعتبار سے جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ بانیٔ ریاست ٹونک نواب امیر الدولہ بہادر کے دربار سے وابستہ نائب میر منشی بساون لال شاداںؔ ریاست کے اوّلین غیر مسلم شاعر و ادیب تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انہیں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں تحریر و شاعری کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب، مؤرخ، منظر نگار اور گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے۔ آپ ہندو تھے مگر مذہبی عقائد کے اعتبار سے آپ خداوندِ قدوس کے وحدہٗ لاشریک ہونے پر یقین رکھتے تھے۔ خدا کی حمد و ثنا کے علاوہ شاداںؔ کو آنحضرت محمدؐ سے بھی قلبی عقیدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تصانیف بالخصوص امیر نامہ میں اولاً حمدیہ و نعتیہ اشعار سے شروعات کرتے ہوئے خدا کے فضل سے امیر خاں کے مسند نشین ہونے کا ذکر کیا ہے۔

دراصل بساون لال شاداںؔ کی شہرت کا دار و مدار اُن کی مابہ الامتیاز تصنیف 'امیر نامہ' پر ہی منحصر ہے۔ امیر نامہ فارسی زبان میں تحریر کی گئی ریاست ٹونک کی اولین ادبی و تاریخی تصنیف ہے جس کا محور بانیٔ ریاست نواب امیر الدولہ بہادر کی سیرت و سوانح اور جنگی فتوحات و اہم واقعات کو قلمبند کرنا تھا۔ لیکن امیر نامہ محض سیرت و سوانح ہی نہیں شعری و نثری اعتبار سے بھی ایک اہم تصنیف ہے۔ شاداںؔ کے ہی عہد کے دربار امیر خاں سے وابستہ شاعر و ادیب فقیر محمد خاں گویاؔ (اجداد جوشؔ ملیح آبادی) نے اپنی تصنیف 'بستانِ حکمت' میں "امیر نامہ" کا ذکر اس انداز میں کیا ہے :

> "اس کا (امیر خاں کا) بیان اپنی زبان اور زبان قلم سے ادا نہیں ہو سکتا لیکن کچھ تھوڑا سا حال بندے کا 'امیر نامہ' سے کہ جو تاریخی حالات ہیں اس امیر کے کسی ہندو نے تالیف کی ہے، دریافت ہو سکتا ہے۔"

(انتخاب بستانِ حکمت، فقیر محمد خاں گویا مرتب نیر مسعود، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۸ء، ص ۱۹)

"امیر نامہ کے اولاً انگریزی زبان میں تراجم ہوئے۔ اس کے بعد اردو اور ہندی زبانوں میں کئی تراجم ہوئے ہیں۔ فارسی میں مولوی نجف علی جھجھری نے سمبت ۱۲۲۸ میں 'لباسی امیر نامہ' کے عنوان سے نثر و نظم میں امیر نامہ سے متعلق واقعات بصورتِ ترجمہ تحریر کیے تھے، جواب گمنام و ناپید ہیں۔ اسی طرح ۱۸۳۱ء میں جنرل میٹکاف کے حکم سے جان بولی صاحب نے کلکتہ میں امیر نامہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ بھی اب ناپید و گمنام ہے۔ انگریزی زبان میں ایک اہم ترجمہ ٹی۔ ہنری پرنسپ نے لارڈ ولیم بینٹک کے حکم سے مئی ۱۸۳۲ء میں کیا تھا، جو اسی سال شائع بھی ہوا۔ اس سے قبل کے مذکورہ دونوں تراجم ناپید و گمنام ہونے کے سبب ٹی ہنری پرنسب کے ترجمے کو ہی اولیت حاصل ہے۔ امیر نامہ کا ایک منظوم ترجمہ فارسی زبان میں ۱۸۳۵ء میں پائندہ خاں نکہتؔ رامپوری نے کیا تھا۔"

ریاست ٹونک کے عہد امیری کی معروف غیر مسلم شخصیات میں مدارالمہام رائے ہمت رائے، ان کے فرزند رائے داتا رام، منشی خاص بھوانی پرساد، وکیل نرنجن لال اور توشہ خانہ انچارج منشی دولت رائے بالخصوص اپنی انتظامی صلاحیت وتجربات کے باعث دربار میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔لیکن بساون لال شاداںؔ وہ واحد شخصیت تھے جنہوں نے نائب میر منشی کے فرائض وذمہ داریوں کو ہی بحسن وخوبی نہ صرف انجام دیا بلکہ وہ علم وادب کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے۔اُن کا سب سے اہم ادبی وتاریخی کام'امیر نامہ'کی تصنیف ہے جو انہیں آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔بساون لال شاداںؔ نے امیر نامہ میں امیر خاں کی بہادری،فتوحات اور جنگی کارناموں کو اس طرز میں بیان کیا ہے کہ قاری ان کے اندازِ بیان کا قائل ہوئے بنا نہیں رہتا۔امیر خاں کی سیرت وشخصیت پر یہ واحد تصنیف تھی جسے اُس عہد میں ایسا قبولِ عام حاصل ہوا کہ اس کی پیاں ونقول متواتر فی الفور تقسیم ہوتی رہیں۔اس کے انگریزی واردو زبانوں میں بھی متعدد تراجم ہو کر منظر عام پر آئے،جس سے اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔

شاداںؔ کے سوانحی اشارے :

بساون لال شاداںؔ نے امیر نامہ میں خود سے متعلق جو سوانحی اشارے مختصراً پیش کیے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

''احقر بساون لال متخلص شاداںؔ بن تن سکھ رائے،قوم کایستھ ساکن خطۂ پاک بلگرام،علاقہ لکھنؤ وارد۔''

(دیباچہ امیر نامہ)

درج بالا نہایت مختصر تحریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ منشی بساون لال شاداںؔ قوم کایستھ قصبہ بلگرام علاقہ لکھنؤ کے باشندے تھے۔اُن کی اولاً علمی تربیت بھی وہیں ہوئی۔بلگرام اودھ کا وہ قصبہ تھا جہاں فارسی زبان کی تدریس وتعلیم عام تھی۔یہاں اس وقت عربی وفارسی زبانوں کے کئی عالم موجود تھے۔شاداںؔ نے بھی ان اساتذہ سے کسب فیض کیا۔

شاداںؔ ریاست ٹونک کے مدارالمہام رائے داتارام کے رشتے میں بھانجے تھے۔اسی توسط سے وہ ریاست ٹونک کے لشکر میں موہن سنگھ کیمپ میں ملازم ہو گئے۔۱۸۱۴ء میں جب میر منشی بھوانی پرساد نے وطن جانے کے لئے رخصت چاہی تو رائے داتارام نے ان کے عوض شاداںؔ کو نائب منشی کے عہدے پر مقرر کروا دیا۔اس طرح شاداںؔ کو نواب امیر خاں کے حضور حاضری کا موقع مل گیا۔شاداںؔ کی صلاحیت بروئے کار آنے پر انہیں نواب صاحب نے امیر نامہ تحریر کرنے کے لئے مقرر کیا۔

نواب امیر خاں کی وفات ۳۰ر ستمبر ۱۸۳۴ء کو ہو گئی۔اُن کے فرزند نواب وزیرالدولہ نے مسند نشین ہونے کے بعد شاداںؔ کا منصب بڑھا کر انہیں میر منشی بنا دیا۔۱۸۳۶ء میں نواب وزیرالدولہ نے وکیل کی حیثیت سے انہیں کلکتہ پہنچایا۔یہاں سر چارلس میٹکاف سے اُن کی ملاقات ہونے پر انہیں شاداںؔ نے امیر نامہ نذر کیا۔میٹکاف شاداںؔ کی علمی صلاحیات سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے سکریٹری سے فرمایا''ایسا قابل وکیل اب تک غالباً کوئی نہیں آیا ہوگا۔''نواب صاحب کی خواہش پر شاداںؔ واپس ٹونک آ گئے تھے۔یہیں اسی سال ذی الحجہ میں ان کا انتقال ہوا۔اس طرح بساون لال شاداںؔ ۱۸۱۴ء سے ۱۸۳۶ء تک ریاست ٹونک سے وابستہ رہتے ہوئے اپنے منصب کے علاوہ علمی وادبی کارہائے نمایاں بھی انجام دیتے رہے۔'امیر نامہ'ہی اُن کا وہ ادبی اور تاریخی کارنامہ ہے جو انہیں تاریخ ہند میں زندہ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہے۔

شعری صلاحیات :

بساون لال شاداںؔ کی تصنیف'امیر نامہ'اگرچہ ایک نثری وسوانحی تخلیق ہے لیکن اس کتاب میں شاداںؔ کی شاعرانہ قدرت بھی باصرہ نواز ہوتی ہے۔شاداںؔ نے اپنے تسکین ذوق کے لئے متعدد موقعوں پر واقعات کے دوران بیان کثرت سے فارسی اشعار تحریر کیے ہیں۔امیر نامہ کی ابتداء حمدیہ اشعار سے ہوتی ہے،اولین حمدیہ شعر اس طرح ہے :

بنام جہاں دار کون ومکاں   کہ فتح وشکست است در حکم آں

ترجمہ:کون ومکاں کے اس سپہ دار کے نام سے شروع کرتا ہوں جس کے حکم میں فتح وشکست ہے۔

امیر نامہ کا اختتام بھی فارسی اشعار پر ہوتا ہے۔دراصل شاداںؔ فی الفور شاعری پر قادر ہونے کے ساتھ کئی اصنافِ سخن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔انہوں نے اپنی تصنیف میں نظم،قصیدہ،رُباعی اور قطعات وغیرہ کو حسب موقع شامل کیا ہے۔شاداںؔ نے اردو میں نواب امیر خاں کی مدح میں ایک مثنوی بھی تحریر کی تھی،جس کا ذکر لالہ سری رام نے اپنی تصنیف''خم خانۂ جاوید''میں حصہ چہارم کے صفحہ ۴۷۵ پر کیا ہے مگر اب یہ مثنوی نایاب ہے۔منشی دیبی پرشاد نے تذکرہ''آثار الشعرائے ہنود''میں لکھا ہے کہ''شاداںؔ نے اردو میں ایک مثنوی کھٹمل نامہ بھی لکھی ہے۔''

(آثار الشعرائے ہنود:دیبی پرشاد ۱۸۸۵ء،رضوی پریس،دہلی ص ۷۶)

مثنوی کے دو اشعار ملاحظہ ہوں :

ذکر کھاٹوں کا کیجئے گر ارقام   نقطے کاغذ کے کاٹتے ہیں مدام

کھٹملوں سے دوات ہے لبریز   رنگ سیاہی کا شگرف آمیز

شاداںؔ کی ایک رباعی بھی مذکورہ تذکرے میں موجود ہے،جو اس طرح ہے۔

گل گلاب نے خوبی عجب دکھائی ہے   بہار جامۂ گلگوں پہن کے آئی ہے

جو پوچھو سچ تو یہ ہے برکت قدوم حضور   وگرنہ گل نے یہ خوبی کہاں سے پائی ہے۔

امیر نامہ اپنے نثری اوصاف کے علاوہ شاعرانہ حسن سے بھی مالا مال ہے۔مذکورہ تخلیق میں دکن کے امراء ہولکر کی مسندنشینی،نواب امیر خاں کی بے خوف شجاعت،ہولکر کی وفات پر تاریخی اشعار،راجکماری کرشنا کماری کی تصویرکشی،سنبھل شہر کے علاوہ نذر باغ اور رنگین کوٹھی کی تعریف،امیر نامہ کی تکمیل ہونے پر نواب امیر خاں کی مدح وستائش،نواب وزیرالدولہ وغیرہ کی مدح مؤثر اور دلکش الفاظ میں نہایت ہی ہنرمندی سے شاعری میں کی گئی ہے۔اُن کی شاعری میں تاریخ گوئی کے نمونے بھی جا بجا موجود ہیں۔جس سے نثر کے ساتھ شاعری وتاریخ وگوئی میں بھی اُن کی مہارتِ تامہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

امیر نامہ کے تراجم :

امیر نامہ کے اولاً انگریزی زبان میں تراجم ہوئے۔اس کے بعد اردو اور ہندی زبانوں میں کئی تراجم ہوئے ہیں۔فارسی میں مولوی نجف علی جھجھری نے سمبت ۱۲۲۸ میں'لباسی امیر نامہ'کے عنوان سے نثر ونظم میں امیر نامہ سے متعلق واقعات بصورتِ ترجمہ تحریر کیے تھے،جو اب گمنام ونایید ہیں۔اسی طرح ۱۸۳۱ء میں جنرل میٹکاف کے حکم سے جان بولی صاحب نے کلکتہ میں امیر نامہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔یہ ترجمہ بھی اب ناپید وگمنام ہے۔انگریزی زبان میں ایک اہم ترجمہ ٹی-ہنری پرنسپ نے لارڈ ولیم بینٹک کے حکم سے مئی ۱۸۳۲ء میں کیا تھا،جو اسی سال شائع بھی ہوا۔اس سے قبل کے مذکورہ دونوں تراجم ناپید وگمنام ہونے کے سبب ٹی ہنری پرنسپ کے ترجمے کو ہی اولیت حاصل ہے۔امیر نامہ کا ایک منظوم ترجمہ فارسی زبان میں ۱۸۳۵ء میں پائندہ خاں نکہتؔ رامپوری نے کیا تھا۔جس کا اردو میں ترجمہ عصر حاضر میں ٹونک کے معروف مثیر سخن ابن احسن بزمیؔ نے کیا تھا۔مذکورہ ترجمہ شائع نہ ہو سکا۔فارسی زبان میں ایک منظوم ترجمہ حکیم سلطان محمود خاں نے ۱۲۸۳ھ م ۱۸۶۷ء میں کیا۔یہ ترجمہ بھی اب گمنام ونایید ہے۔

اردو زبان میں امیر نامہ کا اولاً ترجمہ کپتان جے-بلیئر کے حکم سے مولوی حکیم سید احمد علی سیمابؔ نے کیا تھا(جس کا ذکر مختلف حوالوں سے کتب میں ملتا ہے)دوسرا ترجمہ اردو میں اُن

کے فرزند سید سعید احمد اسعدؔ نے ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں مکمل کیا تھا۔(باز یافت میں ۱۸۷۸ء لکھا ہے)اسعدؔ ٹونک و دہلی کے معروف ترین مشیرِ سخن بسملؔ سعیدی کے والد بزرگوار تھے۔سیمابؔ و اسعدؔ کے تراجم بروقت شائع ہونے کے باوجود اب دستیاب نہیں۔ایک مزید اردو ترجمہ منشی دیبی پرشاد بشاشؔ نے 'افتخار التواریخ' کے نام سے ۱۹۰۹ء میں کیا۔جو اُسی برس شائع بھی ہوا۔فی زمانہ ایک اور اردو ترجمہ آج سے تقریباً ۳۰ سال قبل مولوی جمیل احمد نے کیا تھا جو ۲۰۲۰ء میں راجستھان سرکار کے ادارے مولانا ابوالکلام آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔جس کا مقدمہ سابق ڈائریکٹر مذکورہ ادارہ صاحبزادہ ڈاکٹر صولت علی خاں نے تحریر کیا ہے۔امیر نامہ کا ایک ہندی ترجمہ مذکورہ ادارے ہی کی جانب سے ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا،اس کے مترجمین مرحوم ڈاکٹر ریاض الدین خاں اور آنجہانی ہنومان سنگھل تھے۔

تقسیم ابواب :

منشی بساون لال شاداںؔ نے امیر نامہ کو چار مختلف حصوں و ابواب میں منقسم کیا ہے۔باب اول میں امیر خاں کی حیات سے متعلق ابتدائی واقعات (اُن کی ولادت،سلسلہ نسب اور زمانہ طفولیت کے واقعات) دوسرے باب میں دکن سے متعلق جنگی حالات و فتوحات،تیسرے باب میں امیر خاں اور جسونت راؤ ہولکر کا انگریزوں و دیگر امراء کے خلاف متحدہ جنگی محاذ اور جدو جہد کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔چوتھے اور اختتامی باب میں انگریزوں اور نواب امیر خاں کے مابین ہوئے واقعات اور ۱۸۱۷ء کے معاہدے کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔

دراصل امیر نامہ میں ذکر کردہ واقعات کے مطابق اس دورِ انتشار میں ہولکر اور امیر خاں کے علاقوں کے علاوہ تقریباً پورے ہندوستان کی دیسی ریاستوں پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔اِن دونوں ہستیوں نے راجپوتانہ اور روہیلکھنڈ میں کئی جگہ انگریزی فوج کو بری طرح روند دیا تھا۔کئی بڑی جنگوں میں انگریزوں کی متحدہ فوج کی شکستِ فاش ہونے پر وہ ان دونوں ہستیوں (امیر خاں) سے لرزہ خیز تھے۔لہٰذا انگریزوں نے اپنی پالیسی کے تحت راجہ ہولکر کو اپنے دام میں پھنسایا اور انہوں نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا۔لیکن امیر خاں کے حوصلے ابھی بلند تھے وہ ہندوستانی امراء،کابل کے شاہ شجاع اور پٹھانوں کی متحدہ طاقت سے انگریزوں کو پوری طرح شکست دے کر ہندوستان سے انہیں نکالنا اور ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔اس سلسلے میں مہاراجہ ہولکر اور نواب امیر خاں کے درمیان ہوئی گفتگو کا ذکر سید اصغر علی آبروؔ نے اپنی معروف تصنیف ''حدیقۂ راجستھان'' میں اس طرح کیا ہے:

''میں (امیر خاں) انگریزوں کو ہندوستان سے نکالوں گا۔'' اس پر مہاراجہ ہولکر نے کہا ''جو بادشاہ نہیں آئے۔'' اس پر امیر خاں نے کہا کہ ''میں اٹک جا کر اپنے ہم وطن، ہم قوم پٹھانوں کو جمع کروں گا۔سر نہیں سرو نہیں۔''

(حدیقۂ راجستھان: سید اصغر علی آبروؔ، ۱۹۰۱ء، آگرہ، صفحہ ۱۱)

لیکن بالآخر تنہا رہ جانے بحالتِ مجبوری دل سے نہ چاہ کر بھی امیر خاں نے انگریزوں سے معاہدے کی رو سے ۱۸۱۷ء میں ریاست ٹونک حاصل کی تھی۔اس طرح باعث معاہدے پر بعض انگریز حکام نے اعتراض بھی کیا۔جس پر انگریز جنرل نے کمپنی کی جانب سے جو جواب دیا وہ مصنف ''وقائع راجپوتانہ'' کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

''ہم نے حکمتِ عملی سے ایک شیر کو ریاست داری کے قفس میں قید کر لیا ہے۔ اگر منظور نہ ہو تو اس کو پھر آزاد کر دیجئے اور تماشہ دیکھئے کہ کیا پُر ضرر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔''

(وقائع راجپوتانہ از دیبی پرشاد ص ۳۱۵)

ڈاکٹر قانون گو نے امیر خاں اور امیر نامہ سے متعلق لکھا ہے کہ:

''تاریخ نے ان (امیر خاں) کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ ہندوستان کا سب سے بڑا آخری فوجی مدبر اور آزادیٔ ہند کا سب سے بڑا شہباز تھا...... امیر نامہ اس مردِ مجاہد کی سچی کہانی اور اس کی جنگی روداد ہے۔''

(ہسٹوریکل ایسے (Essay) از قانون گو ص ۱۷۲)

امیر نامہ اپنے عہد کا تاریخ ساز مخطوطہ ہونے کے باوجود بھی بعض اغلاط و کمیوں سے مبرا نہیں۔جنگ اور واقعات کے بیان میں کئی موقعوں پر تاریخ، ماہ و سال کا اندراج درست نہیں ہے۔ڈاکٹر ایس-کے-مہرا نے اپنے تحقیقی مقالے بعنوان ''لائف اینڈ ٹائم آف امیر خاں'' (۱۷۶۸-۱۸۳۴) تحریر شدہ برائے پی ایچ ڈی ۱۹۶۶ء (اُجین یونیورسٹی) میں مذکورہ کوتاہیوں کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ٹونک کی ایک علمی شخصیت ثروت علی خاں نے اس کا اردو میں ترجمہ ''امیر خاں کے حالات زندگی اور اُن کا دور'' عنوان سے ۱۹۹۹ء میں کیا ہے۔ڈاکٹر ایس کے مہرا نے اپنے مقالے میں واضح طور پر لکھا ہے کہ:

''تاہم بساون لال کی یہ سوانح حیات خامیوں کے باوجود ایک ایسا خاکہ پیش کرتی ہے۔جس کی مدد سے امیر خاں کی کوئی بھی دوسری سوانح لکھی جا سکتی ہے۔امیر خاں کی ابتدائی دوڑ دھوپ کے لئے یہ ہمارا واحد مآخذ ہے۔''

(بحوالہ امیر خاں کے حالاتِ زندگی اور ان کا دور از ایس کے مہرا مترجم ثروت علی خاں صفحہ ۴۴۴)

اس طرح بعض اغلاط و خامیوں کے باوجود بھی امیر نامہ کی مؤرخانہ، عالمانہ و ادبی اہمیت مسلم ہے۔امیر نامہ کے توسط سے ہی امیر خاں کی شخصیت، اُن کے افکار و عقائد، مختلف جنگی محاذ میں اُن کی فتح و شکست، اُن کی قومی یکجہتی کے علاوہ منشی بساون لال شاداںؔ کے نثری و شعری اسلوب کا فنی مظاہرہ، اُن کی علمیت و ادبی خدمات، اُن کی منظر نگاری، تاریخ گوئی، تاریخ دانی وغیرہ علمی اوصاف کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

بحیثیت مجموعی امیر نامہ تاریخِ ہند کا ایک نایاب مخطوطہ ہونے کے باعث نواب امیر الدولہ کے تاریخ ساز کارناموں اور منشی بساون لال شاداںؔ کی علمی و ادبی خدمات کو اہلِ علم عوام سے دائمی طور پر روشناس کراتا رہے گا۔

□□□

گزارش

برائے کرم اشاعت کے لیے اپنی تخلیقات کے ساتھ اپنے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات، بینک اکاؤنٹ نمبر، بینک کا نام و برانچ کا نام، آئی ایف ایس سی کوڈ نمبر ضرور تحریر کریں۔

اس کے بغیر کسی بھی تخلیق کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔

Name:-
Account No:-
Bank and Branch Name:-
IFSC No:-

ایڈیٹر نیا دور

ڈاکٹر احسان عالم

پرنسپل الحراء پبلک اسکول، احمد کامپلیکس، لال باغ، دربھنگہ

9431414808

پطرس بخاری: اردو کا نمائندہ طنز و مزاح نگار

اصل نام سید احمد شاہ اپنے قلمی نام پطرس بخاری سے معروف تھے۔ ان کی پیدائش یکم اکتوبر 1898 کو ہوئی۔ پطرس ایک ذہین ادیب تھے۔ ان کا مطالعہ بہت گہرا اور معلومات وسیع تھیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ ساٹھ سال کی عمر تک انہیں ساٹھ ستر نہ سہی سات آٹھ کتابیں لکھنی چاہئے تھیں مگر وہ پیشہ ور انشاء پرداز نہیں تھے۔ جب جی چاہا لکھتے اور جب تک جی نہیں چاہتا تھا نہیں لکھتے تھے۔ چنانچہ ابتدا سے ہی ان کی یہی روش رہی۔ زیادہ لکھنا کوئی خوبی کی بات نہیں ہے بعض ایسے زود نویس ہوئے ہیں جن کی بیسوں کتابیں چھپیں مگر بارہ پندرہ سال بھی ان کتابوں نے زندگی نہیں پائی۔ آج ان کی کتابیں تو کیا نظر آئیں گی نام بھی سننے کو نہیں ملتے۔ ان کے مقابلے میں بعض ایسے بھی کم نویس نظر آتے ہیں جن کی کتابیں گنی چنی ہیں مگر انہیں سر آنکھوں پر لئے پھرتے ہیں۔ انہیں آخرالذکر میں پطرس بخاری کا بھی شمار ہے۔ چند مضامین، چند ترجمے، چند ناول بس یہی کائنات پطرس کی ہے۔ مگر ان کی نگارشات ادبی قدر و قیمت میں بہتر سے بہتر ہیں۔ وہ اردو کے نامور مزاح نگار، افسانہ نگار، مترجم، شاعر، نقاد اور معلم تھے۔ ان کا شمار متحدہ ہندوستان میں نشریات کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

> ''پطرس کا ذوق مزاح نہایت بلند ہے۔ ان کا مزاح لفظی قلابازیوں، تخریب و نشتریت اور عمل مذاق سے پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے زندگی کے مضحک پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے وقت یا کردار کی بوالعجبیوں یا صورت واقع کی ناہمواریوں کو اجاگر کرتے ہوئے ایک ہمدردانہ انداز نظر کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے مزاح میں خلوص، صحت مند کیفیات اور سادگی سے پطرس اپنے آپ کو زیادہ تر مزاح کا نشانہ بناتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ دوسروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ اپنے اوپر ہنستے ہوئے بھی تحقیر آمیز رویہ اختیار نہیں کیا ہے بلکہ اس میں توازن و اعتدال اور شخصی وقار کا خیال رکھا ہے۔ چونکہ انہوں نے اکثر مضامین واحد متکلم کی صورت میں لکھے ہیں اس لئے واضح ہوتا ہے کہ ان کے مزاح کا رخ خود ان کی طرف ہے۔ واحد متکلم کا استعمال ان کے اسلوب کی خاص خصوصیات ہے مثلاً ان کے مضامین ''مرحوم کی یاد میں''، ''مرید پور کا پیر'' ''سویرے جو کل میری آنکھ کھلی''، ''کتے''، ''ہوسٹل میں پڑھنا'' مزاح کی شاہکار ہیں۔''

پطرس اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ فرائض منصبی کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود انہوں نے علم و ادب کی خدمت کا موقع نکال لیا اگرچہ ان کی تحریریں کم ہیں مگر جتنی بھی ہیں ادبی اعتبار سے اعلیٰ معیار کی حامل ہیں۔ پطرس کے مضامین ظرافت سے پر ہیں انہوں نے خالص ظرافت کو اپنی تحریروں میں اپنایا۔ خالص ظرافت کا رجحان اردو ادب میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ دراصل اردو نثر میں ظرافت کی کہانی طنز کی کہانی ہے۔ اردو نثر میں خالص ظرافت کے مقابلے طنز کا فروغ زیادہ ہوا ہے۔ کیونکہ خالص ظرافت کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس زمانے میں ناپید تھے۔ خالص ظرافت کے لئے سکون و عافیت کا ہونا ضروری ہے لیکن اردو نثر کا فروغ ایک طویل سیاسی کشمکش اور تصادم کا دور ہے۔ ایسے میں خالص ظرافت کے بجائے طنز کے فروغ کے لئے فضا زیادہ سازگار تھی۔ خالص مزاح کے فروغ کے لئے دوسری چیز زندگی کے تئیں ہمدردانہ انداز نظر، زندگی سے انس اور ان کی ناہمواریوں کا تبسم کے ساتھ خیر مقدم کرنا ضروری ہے اور یہ رجحان اردو میں عام طور پر ناپید رہا ہے۔ زندگی کے تئیں نفی کا رجحان اردو میں زیادہ فروغ پایا ہے۔ اس وجہ سے اردو ادب میں بہت کم ایسے ادیب گذرے ہیں جنہوں نے زندگی کی صعوبتوں کو تبسم کے ساتھ خیر مقدم کیا ہو اور اپنی اعلیٰ حوصلگی کے بنا پر زندگی کے ساتھ اس کا انداز نظر ہمدردانہ رہا ہو۔ انہیں چند لوگوں میں پطرس بھی ہیں۔ پہلے غالب کے خطوط میں ہمیں خالص مزاح کے نقوش ملتے ہیں۔ غالب نے بھی زندگی سے فرار حاصل کرنے کے بجائے اس سے قریب تر ہو کر سینے سے لگانے کی کوشش کی تھی۔ زندگی کے تئیں یہی انداز ہمیں پطرس کے یہاں بھی ملتا ہے۔ پطرس نے بھی اپنے زمانے کے شدید فکری اور احساسی بحران کے باوجود زندگی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ زندگی میں مصیبت اور بحران کے باوجود اس سے مخلوط ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ زندگی کے تئیں اسی مثبت رویے کی وجہ سے ان کے مضامین میں ظرافت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

پطرس بخاری نے واقعات کے بیان میں لفظوں کے انتخاب اور جملوں کی بنت اتنی خوبصورتی سے کی ہے کہ مزاح سے مل کر ان کی تحریر اور خوبصورت اور دلکش بن گئی ہے۔ قاری ان کی تحریروں کو جیسے جیسے پڑھتا ہے ویسے ویسے فلم کی طرح سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگتا ہے۔ ان کی تحریروں کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے محاوروں اور کہاوتوں کے ذریعہ بھی مزاح پیدا کیا ہے۔ اس طرح ان کی تحریروں میں جگہ جگہ استعارات بھی نظر آئیں گے۔ اس کے ذریعہ بھی انہوں نے واقعے کی تصویر اور مزاحیہ کے رنگ کو دلکش بنایا ہے۔

پطرس بلا کے ذہین اور تیز طرار تھے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مزاح کا پہلو نکال لیا کرتے تھے۔ ہر چیز کو مزاح کے نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ دراصل وہ زندگی سے بیزار نہیں تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ زندگی کی مختلف کیفیات سے مسرت حاصل کی جائے۔ ان کی ظرافت صرف تفریحاً نہیں تھی۔ اپنے غیر معمولی مشاہدہ سوجھ بوجھ اور غور وفکر کے ذریعے زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو مزاح کے ساتھ پیش کرنا ان کا فطری رجحان بن گیا تھا۔ بقول احمد جمال پاشا:

> ’’اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کا مقصد تفریح ہرگز نہیں تھا۔ وہ اپنی ذات سے بلند ہو کر سوچتے تھے، قدرت نے انہیں ایسی غیر معمولی اور سدابہار طبیعت عطا کی تھی جس کی گہرائی اور ذہانت نے ان کی مزاح نگاری کو ان کا بالکل فطری مشغلہ بنا دیا تھا۔‘‘

(پطرس بخاری، مضامین پطرس، ص:11-10)

پطرس کو مغربی ادب پر کافی عبور حاصل تھا اور اس سے انہوں نے فائدہ بھی اٹھایا اور مغربی ادب کی رعنائیوں اور لطافتوں کو اردو ادب میں سمونے کی کوشش بھی کی۔ مگر انہوں نے مغربی اثرات کو بڑے بالواسطہ طریقے سے اردو میں برتا ہے۔ کہیں سے بھی ایسا نہیں لگتا ہے کہ انہوں نے مغربی ادب کی نقالی کی ہے بلکہ انگریزی اثرات کو مقامی رنگ میں ڈھال کر اردو ادب میں برتا ہے۔ انگریزی ادب سے ان کی شناسائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہوں نے خالص مزاح کے حربوں سے اپنی تحریر کو سجایا۔ ہمارا خالص مزاج جس میں ابھی تک ہزل، پھکڑ اور عامیانہ پن کے عناصر تھے یک لخت بڑی سنبھلی ہوئی کیفیات کا حامل بن گیا۔ پطرس پر انگریزی ادب کے بالواسطہ اثرات کا ذکر کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ’’پطرس جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اردو نثر میں اس خالص مزاح کے سب سے بڑے علمبردار ہیں اور اگرچہ ان کے سوچنے کا انداز اور مزاح نگاری کے حربوں کا استعمال انگریزی اثرات کا غماز ہے لیکن یہ اثرات اتنے بالواسطہ ہیں اور انہوں نے اپنے معاشرے کے پس منظر کو اس درجہ ملحوظ رکھا ہے کہ ان کی نگارشات خالص تخلیقی ادب کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔‘‘

(پطرس بخاری، مضامین پطرس، ص:17)

پطرس نے مزاح نگاری کے فطری انداز کو اپنی تحریروں میں مغربی ادب کی رعنائیوں اور لطافتوں کے ساتھ سمویا ہے۔ اس سبب سے ان کی تحریروں میں تسلسل، روانی اور انتخاب ہے۔ وہ جانتے تھے کہ کیا لینا چاہئے اور کیا چھوڑنا چاہئے۔ اپنی ذہانت کے ذریعے زندگی کے بنیادی کوششوں کو روشنی میں لے آئے ہیں۔ پطرس کے موضوعات بالکل سیدھے سادے اور روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس سادگی میں بے پناہ سنجیدگی ہے اور اس سنجیدگی میں ایسی غیر محسوس ذہنی منطق ہے جو بالکل چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج اخذ کر لیتی ہے۔

ویسے تو پطرس نے مزاح کے سارے حربوں کو کام میں لایا ہے۔ توازن، مقابلہ، کردار، واقعہ اور اسٹائل سب سے مل کر ان کے مزاح کا تانا بانا بنایا گیا ہے لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ ان کی ظرافت دراصل واقعہ کی مرہون منت ہے۔ واقعہ کے ذریعہ انہوں نے کمال کا مزاح پیدا کیا ہے وہ واقعہ کی مختلف کڑیوں کو باہم مربوط اس طرح کرتے ہیں اور اس کی مضحک کیفیات کو فطری انداز میں یوں اجاگر کرتے ہیں کہ قاری خندہ آور ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ان مضحک کیفیات کو اجاگر کرنے میں ان کی شعوری کوشش کا دخل نہیں ہوتا ہے۔ بقول وزیر آغا:

اس میں کوئی شک نہیں کہ پطرس کی مزاح نگاری کو مزاحیہ تقابل، مزاحیہ کردار اور اسٹائل کی خندہ آور کیفیات سے تقویت ملتی ہے تاہم دراصل ان کی مزاح نگاری کا طرّۂ امتیاز وہ مضحک کیفیات ہیں جو صورت واقعہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ پطرس کو صورت واقعہ کی تعمیر کا ایک خاص سلیقہ ہے وہ واقعہ کی مختلف کڑیوں کو اس انداز سے مربوط کرتے ہیں کہ مضحک کیفیات کی نمود کسی شعوری کاوش کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتیں بلکہ خود حالات و واقعات سے ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔‘‘

(انتخاب مضامین پطرس، پطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی، ص:34)

پطرس کا ذوق مزاح نہایت بلند ہے۔ ان کا مزاح لفظی قلابازیوں، تخریب ونشتریت اور عمل مذاق سے پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے زندگی کے مضحک پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے وقت یا کردار کی بوالعجبیوں یا صورت واقع کی ناہمواریوں کو اجاگر کرتے ہوئے ایک ہمدردانہ انداز نظر کا مظاہر کیا ہے۔ ان کے مزاح میں خلوص، صحت مند کیفیات اور شادگی سے پطرس اپنے آپ کو زیادہ تر مزاح کا نشانہ بناتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ دوسروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ اپنے اوپر ہنستے ہوئے بھی تحقیر آمیز رویہ اختیار نہیں کیا ہے بلکہ اس میں توازن و اعتدال اور شخصی وقار کا خیال رکھا ہے۔ چونکہ انہوں نے اکثر مضامین واحد متکلم کی صورت میں لکھے ہیں اس لئے واضح ہوتا ہے کہ ان کے مزاح کا رخ خود ان کی طرف ہے۔ واحد متکلم کا استعمال ان کے اسلوب کی خاص خصوصیات ہے مثلاً ان کے مضامین ’’مرحوم کی یاد میں‘‘، ’’مرید پور کا پیر‘‘ ’’سویرے جو کل میری آنکھ کھلی‘‘، ’’کتے‘‘، ’’ہوسٹل میں پڑھنا‘‘ مزاح کی شاہکار ہیں جن میں اپنے واسطے سے زندگی کی مضحک کیفیات اور ناہمواریوں کو مزاح کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا مضمون ’’مرحوم کی یاد میں‘‘ مزاح کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں پطرس زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بڑے شگفتہ اور مزاحیہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔ پورے مضمون میں قاری کہیں بھی زندگی کی کھردری حقیقت کی تلخی محسوس نہیں کرتا بلکہ واقعات اور اسلوب کی پیدا کردہ مضحک کیفیات میں کھو جاتا ہے۔ اتنے بڑے مضمون میں پطرس اپنے شگفتہ اور رنگین اسلوب کے ذریعہ قاری کو کہیں بھی بیزار نہیں ہونے دیتے۔ وہ واقعات کی مختلف کڑیوں کو اس قدر روانی اور برجستگی کے ساتھ مربوط کرتے جاتے ہیں کہ مزاح کی دلچسپی اور شگفتگی کہیں بھی کم نہیں ہوتی۔ قاری اگر مضمون پڑھنا شروع کر دے بنا ختم کئے دم نہیں لیتا اور قاری ہر جگہ مزاح کی پھلجھڑیوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ کہیں کہیں تبسم کی کیفیت قہقہہ تک پہونچ جاتی ہے۔ پطرس کے مزاح میں مسلسل دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ یہ سب ان کے آسان عام فہم مگر شگفتہ اسلوب کا کمال ہے۔ پطرس اپنے مزاح کے لئے استعارات اور تشبیہات کا استعمال نہیں کرتے بلکہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھتے ہیں۔ ان کا انداز ایسا ہے جیسے وہ بے تکلف قاری سے گفتگو کر رہے ہوں۔ ان کی تحریر میں روزمرہ زبان میں چھوٹے چھوٹے تبسم آفریں جملے قاری کو خندہ آور کیفیات سے دوچار کرتے ہیں۔ ان کی عبارات میں کہیں بھی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ روانی، برجستگی اور شگفتگی ان کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ ان کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے احمد جمال پاشا لکھتے ہیں:

> ’’پطرس کی زبان میں بیان کی خوبیاں موجود ہیں۔ سادگی، شگفتگی، آمد روانی، دلچسپی یہ سب خوبیاں ان کو صاحب طرز بنا دیتی ہیں۔ ان کا اسلوب زبان و بیان کی لطافتوں سے مالامال ہے۔ اس میں ظرافت کے لئے نہ وہ الفاظ کے گھروندے بناتے ہیں نہ الفاظ کی چاشنی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اس حسن بیان میں ایسی سادگی ہوتی ہے گویا وہ قاری سے بے تکلف گفتگو کر رہے ہوں۔‘‘

(انتخاب مضامین پطرس، پطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی، ص:35)

پطرس کی زبان کے بارے میں بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ وہ غلط اردو لکھتے ہیں جبکہ زبان و قواعد کی غلطی ان کے ابتدائی مضامین تک ہی محدود ہے۔ اعتراض کے بعد وہ زبان و قواعد کی طرف دھیان دینے لگے اور غور وفکر کے بعد ہی الفاظ کا انتخاب کرنے لگے۔ اس طرح ان کی زبان میں چاشنی اور روانی اس قدر پیدا ہو گئی کہ ان کی ابتدائی غلطیوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ رشید احمد صدیقی ان کی زبان کی غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے دیباچے کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ دیباچہ نہیں غزل ہے جو شخص ایسی غزل لکھ سکتا ہے اس کے سارے قصور معاف کئے جاسکتے ہیں خواہ وہ غلط اردو ہی لکھتا کیوں نہ ہو''۔

(انتخاب مضامین پطرس، پطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی ص:37)

جس دیباچے کو رشید احمد صدیقی نے غزل کہا ہے اس میں ظرافت کی چاشنی ملاحظہ کیجئے:

''اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے، اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں، اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں''۔

(انتخاب مضامین پطرس، پطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی ص:38)

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں واقعات کے مزاح کے ساتھ خیال کا بھی مزاح موجود ہے۔ اس مزاح کو پیدا کرنے میں پطرس کے الفاظ بھی بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ خیال کا مزاح ان کے یہاں دوسری جگہ بھی نظر آتا ہے۔ پطرس معمولی واقعات کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرکے مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں اور زبان و بیان کی سادگی اور شگفتگی کے ذریعہ معمولی واقعات میں دلچسپی پیدا کرنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ پطرس کا مضمون ''کتے'' ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں کتے کے بھونکنے کو جو ایک معمولی واقعہ ہے اپنے شگفتہ اسلوب کے ذریعے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہر جملے میں مزاح کی گدگداہٹ، اور زبان و بیان کی چاشنی کو محسوس کرسکتے ہیں۔ مضمون کی شروعات ہی قہقہہ انگیز ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے لیکن سمجھ میں نہ آنا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے۔ گائے کو لیجئے دودھ دیتی ہے، بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں۔ کہنے لگا کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے''۔

(انتخاب مضامین پطرس، پطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی ص:38)

پطرس ہنگامی مسائل اور موضوعات میں نہیں الجھے بلکہ معمولی اور آفاقی مسائل کو روزمرہ زندگی سے انتخاب کرکے ان کے مختلف گوشوں کو مزاحیہ انداز میں اجاگر کرتے ہیں۔ عام فہم اور روزمرہ کی زبان میں مزاح کا ابھارنا انہیں خوب آتا ہے۔ ''مرحوم کی یاد میں'' آفاقی موضوعات کو اپنایا ہے۔ جیسے دوست کی دھوکہ بازی اور معصومیت کا استحصال ان موضوعات کو بائسکل کے واقعہ سے جوڑ کر اپنے شگفتہ اور شستہ انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری مزاح کی لطافت اور عبارت کے روانی اور برجستگی سے ہر جگہ دو چار ہوتا ہے۔ ایک اقتباس میں بائسکل چلانے کی منظرکشی ملاحظہ کیجئے:

''آخر بائسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی اس پر بائسکل خود بخود چلنے لگی لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے جس میں چاں چوں کی قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ کھڑ کھڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھی۔۔۔۔ جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی۔۔۔۔ جب اتار پر بائسکل ذرا تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے''۔

(انتخاب مضامین پطرس، پطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی ص:78)

پطرس نے اس اقتباس میں کتنی دلچسپ اور بہترین تصویرکشی کی ہے۔ وہ واقعات کی تصویرکشی بہت عمدہ کرتے ہیں۔ جزئیات نگاری میں عام الفاظ کا کتنے انوکھے انداز میں استعمال کیا ہے اور ان کے روزمرہ کے تشبیہات و استعارات میں ندرت اور جدت پائی جاتی ہے۔ اس اقتباس میں برجستگی اور روانی و سلاست بھرپور طریقے سے موجود ہے۔ ان کے تمام تحریروں کی یہی خاصیت ہے۔ پطرس الفاظ کے حسن کارانہ استعمال سے مزاح کا جادو دکھاتے ہیں۔

پطرس بخاری کے مضامین کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ان کا مزاح بالکل خالص ہے یعنی انہوں نے اپنے مضامین میں خالص مزاح کو جگہ دی ہے۔ وہاں کسی کا مذاق اڑانا یا کسی پر کیچڑ اچھالنا یا کسی پر طنز کرنا ان کا مقصد ہرگز نہیں بلکہ ان تمام چیزوں سے خود کو بچاتے ہوئے صاف ستھرا اور خالص مزاح کا نمونہ پیش کیا ہے۔

پطرس نے واقعہ اور خیال کے علاوہ پیروڈی اور تحریف سے بھی بھرپور مزاح پیدا کیا ہے۔ انہوں نے مولوی اسماعیل میرٹھی کی کتاب اردو کی آخری کتاب کی بڑی عمدہ پیروڈی کی ہے۔ زبان و بیان کی مخصوص ترتیب اور الٹ پھیر کے ذریعے خوبصورت مزاح کی تخلیق کی ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھئے:

''ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے، باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے''۔

(رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، ص:211)

لاہور کے جغرافیہ میں بھی کامیاب پیروڈی کی ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے فن کے تمام امتیازات الفاظ کے حسن کارانہ استعمال کا ثبوت ہیں اور ان کی زبان دانی کی رہین منت بھی۔ انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی اور ساتھ ہی ساتھ مغربی ادب سے اچھی طرح شناسائی بھی اس طرح سے وہ اپنے فن کے ذریعہ معمولی واقعہ کو بھی زعفران دار بنا دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے مضامین میں مزاح کی عمدہ مثال کی کمی نہیں اور ان کے یہاں فکر و فن کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ تمام مزاح نگاروں میں الفاظ کے استعمال کے اعتبار سے انہیں انفرادیت حاصل ہے۔

❑❑❑

التماس

''ماہنامہ نیادور'' کو ارسال کیے جانے والے مضامین اور تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے اور مسودات کمپوز شدہ، مکمل ایڈریس، موبائل نمبر اور تصویر کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اشاعت ممکن نہیں ہوگی۔

ادارہ--

جمشیدہ جہاں آرا

اسسٹنٹ پروفیسر گاندربل ڈگری کالج، کشمیر یونیورسٹی سرینگر

9797925895

میر غلام رسول نازکی کی شاعری پر اقبالؔ کے اثرات

میر غلام رسول نازکی جموں وکشمیر کے صفِ اول کے شعراء میں شمار ہیں۔ اُردو کشمیری دونوں زبانوں کے شاعر ہیں۔ نازکی کے یہاں غزل، قطعات اور نظمیں بھی ملتی ہیں۔ نازکی اقبالؔ، جوشؔ اور چکبستؔ کی انقلابی شاعری سے بے حد متاثر تھے۔ نازکی کو اصنافِ سخن میں صنف رباعی اور صنف قطعہ پر خاص مہارت حاصل ہے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ انہیں حبیب خداؐ سے گہرا عشق تھا۔ میر غلام رسول نازکی نے اپنے دور کی اُردو کی مروجہ روایت میں اپنے تخلیقی شعور کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ نئے فکری اور جمالیاتی میدانوں کی جانب بھی قدم بڑھایا۔ غزل کے علاوہ بھی انہوں نے نثریہ اور نظمیہ اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ غزل میں تنوع کی دوسری راہیں ہموار ہوئیں۔ ان کے یہاں انسانی فطرت کو حقیقت کے طور پر برتنے کا رجحان موجود ہے۔ انہوں نے سماجی و وطنی، تاریخی، معاشرتی تصورات کو جدید مفاہیم میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ اس طرح ان کے یہاں ایک الگ طرح کا رچاؤ نظر آتا ہے۔

نازکی نے جس دور میں اپنی شاعری کا آغاز کیا وہ کشمیر میں تحریکِ آزادی کا دور تھا۔ کشمیری عوام کو اپنی مظلومیت، کسمپرسی اور معاشی بدحالی کا شدت سے احساس ہو چکا تھا۔ اس وقت ایک طرف کشمیریوں پر ظلم وجبر کے خلاف احتجاج کی لے تیز ہو رہی تھی تو دوسری طرف قوم فلاح و بہبود کے لئے کام ہو رہا تھا۔ قوم میں حبِّ الوطنی کا جذبہ بڑھ رہا تھا۔ وطنی، قومی، منظری، پیامی، اصلاحی، اخلاقی اور ملی شاعری کا رجحان بڑھنے لگا تھا۔ اس دور میں اقبالؔ کی شاعری جموں وکشمیر کے شعراء کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ جموں وکشمیر کے شعراء بالخصوص کشمیر کے شعراء کو شدت سے متاثر کرنے لگے۔ کشمیر کے شعراء میں اقبالؔ کے فکر وفن اور اسلوب و آہنگ سے سب سے زیادہ میر غلام رسول نازکی متاثر ہوئے ہیں کیونکہ نازکی اُردو اور فارسی شعری روایات کا خاصا عرفان رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اقبالؔ کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ محمد اسد اللہ وانی اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:

> ”اقبالؔ سے متاثر ہونے کا اعتراف نازکی خود کرتے ہیں وہ ان کے کلام کو زندگی کے آغاز سے ہی اپنا جزو جان تسلیم کرتے ہیں اور ان کے اکثر کلام کا از بر ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اسی لئے انہیں اقبالؔ کا حافظ بھی کہا جاتا ہے“۔ ا

نازکی کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبالؔ کی استعمال کی ہوئی اصطلاحیں اور علامتیں ان کے اشعار میں نہ صرف اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں بلکہ ان کی تمام شاعری اقبالؔ کے اثرات کی نمائندگی کرتی ہے۔

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو صنم آشنا ہے تجھے کیا ملے گا نماز میں
اقبالؔ

نہ سرور میرے رکوع میں، نہ حضور میرے سجود میں
نہ نظام میرے قیام میں، نہ گداز میری نماز میں
نازکی

قطعہ نگاری میں وہ بہت ہی مشہور تھے۔ ان کو اس فن میں بہت ہی مہارت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کا اثر نازکی کے قطعات پر زیادہ گہرا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں، رباعیوں اور غزلیات میں بھی اقبالؔ کے اثرات کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ ان کی نظم کا عنوان بھی اقبالؔ کے ایک شعری مجموعے ”بانگ درا“ کا ہی نام رکھا ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

”میر غلام رسول نازکی کے یہاں اور بھی موضوع ہیں جن پر اقبالؔ کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے عقل وعشق، حرکت وعمل دورِ حاضر کی صورتحال، زوال معاشرہ، خودی وغیرہ شامل ہیں۔ اقبالؔ کی نظم میں انسان ایک عظیم ہستی ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ عظمت انسان اقبالؔ کی شاعری کے بنیادی موضوعات میں شمار ہے۔ نازکی بھی اقبالؔ کی طرح عظمت آدم کے ہی گیت گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

میر غلام رسول نازکی کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو و فارسی شعری روایت کی نفاست اور رنگارنگی کافی حد تک ان کے تخیل میں جذب ہو چکی ہے۔ فارسی الفاظ وتراکیب سے ان کا شغف نمایاں ہے لیکن دیگر الفاظ سے بھی انہوں نے اپنی شاعری میں جو کام کیا ہے، وہ جہاں ان کی قادر الکلامی کے ثبوت فراہم کرتا ہے وہیں لفظوں کو برتنے کا صحیح سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ نازکی کے کلام پر اقبالؔ کا اتنا زیادہ اثر ہے کہ ان کی شاعری کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں اقبالؔ کا اثر نمایاں نہ ہو۔ نازکی کے ہر شعر سے لگ بھگ اقبالؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔“

"قطعہ نگاری میں ان کو یدطولیٰ حاصل ہے اس صنف میں علامہ اقبالؔ سے بے حد متاثر ہیں۔۔۔۔۔انہوں نے اپنے قطعات میں تجربات کی ایک فکر انگیز دنیا بسالی ہے۔ان کے قطعات ان کے شعور عصر کے غماز ہیں ان میں جذبات کا ارتعاش بھی ہے مشاہدے کی رنگینی بھی اور فکر کی گہرائی بھی"۔ ۲

اقبالؔ کے افکار کا بنیادی سر چشمہ قرآن اور حبیب خداؐ کی ذات بابرکت ہے۔عشق رسولؐ ان کے یہاں سرمایۂ حیات ہے۔نازکی نے بھی اقبالؔ کی طرح عشق رسول کو ہی بنیادی موضوع بنایا۔ان کے کلام کا بیشتر حصہ نعت رسول سے پُر مشتمل ہے۔ان کی نعتوں میں اقبالؔ کے رنگ کے ساتھ ساتھ حضرت محمدؐ کے تئیں انہیں کے جیسا والہانہ عشق کا جذبہ بھی موجود ہے۔وہ اقبالؔ کی نعتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اُردو زبان میں بڑے بڑے نعت گو شعراء پیدا ہوئے ہیں۔ان میں مولانا ظفر علی خان، حفیظ جالندھری، ہری چند اختر وغیرہ نے بعض ایسی نعتیں لکھیں جن کو بقائے دوام حاصل ہوا اور متاخرین میں عاشق رسولؐ اقبالؔ سب پر بازی لے گئے"۔ ۳

نازکی نے بھی اقبالؔ ہی کی طرح نعت رسولؐ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ذیل میں چند اشعار نمونتاً پیش کئے جاتے ہیں۔

گم ہیں آفاق ذات میں جس کی
علم جس کا ہے بحر و بر پے محیط
نازکی

عالم آب وخاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کو دیا تونے طلوع آفتاب
اقبالؔ

نازکی کے یہاں عشق رسولؐ کے ساتھ ساتھ وہاں کی سرزمین سے محبت ہی نہیں بلکہ گہری عقیدت رہی ہے۔ان کے اکثر اشعار میں مدینہ کا ذکر ملتا ہے۔اقبالؔ نے مدینے شہر کو دنیا کے تمام مراکز سے عظیم اور شاندار کہا ہے۔یثرب کا اکثر استعمال اقبالؔ کے اشعار میں بھی ملتا ہے جیسے:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرہنگ
سرمہ ہے مری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف
اقبالؔ

لوگ کہتے ہیں جنتِ کشمیر
حسن کے تاج کا نگینہ ہے
یہ مرے جسم کا وطن ہے مگر
میرے دل کا وطن مدینہ ہے
نازکی

نازکی اقبالؔ کی طرح عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔عشق ہی زندگی ہے اور عشق سے ہی زندگی کے تمام مراحل طے ہو سکتے ہیں۔

عشق والوں سے نہیں، نام کے دیوانوں سے
کھا گئے اہل خرد مات، خدا خیر کرے
نازکی

میر غلام رسول نازکی کے یہاں اور بھی موضوع ہیں جن پر اقبالؔ کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔جیسے عقل وعشق، حرکت وعمل دورِ حاضر کی صورتحال، زوال معاشرہ، خودی وغیرہ شامل ہیں۔اقبالؔ کی نظم میں انسان ایک عظیم ہستی ہے۔وہ اشرف المخلوقات ہے۔عظمت انسان اقبالؔ کی شاعری کے بنیادی موضوعات میں شمار ہے۔نازکی بھی اقبالؔ کی طرح عظمت آدم کے ہی گیت گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ کس کس موضوع کو نازکی نے اقبالؔ سے لے کر کے اپنا بنانے کی کوشش کی ہے۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے
اقبالؔ

یا الٰہی ہو تمارے آسماں والوں کی خیر
آدم خاکی نہیں ہے اب مہ کامل سے دور
نازکی

نازکی بھی اقبالؔ کی طرح حرکت وعمل کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ اسی سے انسان اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔اسی سے زندگی کی مشکل راہیں آسان ہو سکتی ہیں۔اقبالؔ کی طرح نازکی نے وطنی تصور انہی معنوں میں لیا ہے۔جن میں اقبالؔ نے لیا ہے۔

درویش خداست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
ہمسایۂ جبریل امین بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ سمرقند نہ بخارا

نازکی نے اقبالؔ کی طرح ڈرامائی اور مکالماتی انداز بیان کو بھی اپنی شاعری کا زیور بنایا۔یہ مکالماتی اندازِ بیان اقبالؔ کے قطعات اور نظموں کا بھی نمایاں وصف ہے۔

جو یورپ سے لگا سورج ابھرنے
کہا شبنم کے قطرے سے گہرنے
نہ تھی تجھ میں حلاوت موتیوں کی
فنا انجام کو آیا تھا مرنے
نازکی

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے تجھ کو عطا دیدۂ بینا

اس شعر سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نازکی نے اقبالؔ کی طرح تراکیب، استعارات، تلمیحات، اسلوبِ بیان کو برتنے کی بہترین کوشش کی ہے۔دونوں کے کلام میں انتہائی درجے کی موسیقی ہے۔حامدی کشمیری لکھتے ہیں:

"ان کے یہاں اقبالؔ کے فکروفن اور پیغام کا اثر نمایاں ہے"۔ ۴

میر غلام رسول نازکی کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو وفارسی شعری روایت کی نفاست اور رنگارنگی کافی حد تک ان کے تخیل میں جذب ہو چکی ہے۔فارسی الفاظ وتراکیب سے ان کا شغف نمایاں ہے لیکن دیگر الفاظ سے بھی انہوں نے اپنی شاعری میں جو کام کیا ہے، وہ جہاں ان کی قادر الکلامی کے ثبوت فراہم کرتا ہے وہیں لفظوں کو برتنے کا صحیح سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔نازکی کے کلام پر اقبالؔ کا اتنا زیادہ اثر ہے کہ ان کی شاعری کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں اقبالؔ کا اثر نمایاں نہ ہو۔نازکی کے ہر شعر سے لگ بھگ اقبالؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔

حوالہ:

۱۔اسداللہ وانی، اقبالؔ اور جموں وکشمیر کا اُردو ادب، (غیر مطبوعہ مقالہ،۱۹۵۵ء) ص۔۱۹۶
۲۔پروفیسر حامدی کاشمیری، ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ادب، (سرینگر بگلشن پبلیشرز،۱۹۹۱ء) ص۔۱۲۰
۳۔میر غلام نازکی، چراغ راہ، دیباچہ ص:۱۰۔۱۱
۴۔پروفیسر حامدی کاشمیری، ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ادب، (سرینگر بگلشن پبلیشرز،۱۹۹۱ء) ص۔۷۵

□□□

ڈاکٹر ناظر حسین

شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

9335336222

فارسی زبان و ادب اور راجہ رتن سنگھ زخمیؔ

آج دنیا کے اندر سیکڑوں زبانیں بولی اور پڑھی جاتی ہیں۔ کچھ زبانیں قدیم ہیں تو کچھ زبانیں قدیم و جدید تہذیب سے وجود میں آئیں مگر وہ زبانیں جو ایک قدیم زمانے سے بولی جارہی ہیں۔ اس میں ایک فارسی زبان بھی ہے، گوکہ یہ زبان جو کم وبیش موجودہ شکل میں موجود ہے اس کا وجود اگرچہ تیسری صدی ہجری سے ملتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فارسی زبان اور آریائی زبان ہے۔ اس کی تاریخ اس وقت سے ملتی ہے جس وقت سے سرزمین ایران- پر آریوں کے آمد کا سلسلہ شروع ہوا، مورخین کا خیال ہے کہ ایران میں آریوں کا داخلے کا آغاز آج سے تقریباً تین سو سال قبل ہو چکا تھا، مرور زمانہ کے ساتھ تہذیبیں بدلتی رہیں اور اس کا اثر اس زبان پر بھی پڑا۔ موجودہ دور میں جو فارسی زبان موجود ہے اس کا وجود تیسری صدی ہجری میں ملتا ہے، ایران جب عربوں کے زیر اقتدار آیا گویا کہ اس وقت وہاں عربی زبان کا اثر شروع ہوا پھر بھی فارسی ایران میں فروغ پاتی رہی۔

جب فارسی زبان و ادب کا دائرہ وسیع ہوا تو یہ زبان ایرانی سرحد کو عبور کر کے ہندوستان کی سرحد میں بھی داخل ہوگئی، اور پھر آگے چل کر قرون وسطیٰ میں فارسی زبان ہندوستان کی سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج ہوگئی، اور اہل علم وفضل نے اس زبان کو اپنے افکار ونظریات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے سرکاری دفاتر کے سارے کام اسی زبان میں انجام دئے جانے لگے۔ مغلیہ عہد فارسی زبان کا سب سے تابناک عہد کہا جاتا ہے۔ اس عہد کے حکمران خود صاحب فضل وکمال تھے اس لئے وہ صاحبان علم وفضل کے قدردان بھی تھے، ان کی ذرہ نوازیوں نے ایران کے شعراؤ کو ہندوستان کی جانب متوجہ کیا اور ان کے آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا، ایرانی فنکاروں ادیبوں اور شاعروں کی آمد سے ہندوستان کی تہذیب وفن پر بڑا گہرا اثر پڑا، اس وقت ہندوستان میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک صاحب فضل وکمال ادیب وشاعر موجود تھے جن کی قابلیت کا سکہ صرف ہندوستان ہی سے نہیں، بلکہ ایران میں بھی چل رہا تھا، اور اہل ایران نے ان کی قابلیت کو نہ صرف قبول کیا بلکہ انہیں جائز مقام بھی عطا کیا۔ مسلم حکمرانوں کے ذریعہ فارسی زبان وادب کی قدردانی کو دیکھ کر غیر مسلموں میں بھی اس زبان کو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا جس کی وجہ سے انہیں حکومت میں مناصب بھی ملے، اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے فارسی زبان وادب سے دلچسپی سے یہ زبان سر زمین ہند میں خوب فروغ پائی، ہندوؤں میں کائستھ برادری کے لوگ اس زبان کو سیکھنے میں پیش پیش رہے۔

صوبہ اودھ کا مختصر تعارف:

جب مغل حکمراں اکبر تخت نشین ہوا تو اس نے ملک میں ایک نئی فضاء قائم کرنے کے لئے تقریباً تمام شعبہ جات میں تبدیلیاں کیں، اس میں سب سے اہم تبدیلی یہ تھی کہ اس نے جاگیردارانہ نظام کو ختم کر دیا اور پورے ملک کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا انھیں صوبوں میں ایک اہم صوبہ اودھ کا بھی تھا، اودھ کے حدود اربعہ کے بارے میں ڈاکٹر اشروادی لال شریواستو یوں رقم طراز ہیں۔

> ’’شمال میں ہمالیہ کی پوربی چوٹیاں، شرق میں بہار، جنوب میں (صوبہ الہ آباد) مانک پور تک، اور مغرب میں قنوج تک گورکھپور کے مشرقی حصہ سے قنوج تک تقریباہ دو چالیس میل لمبائی اور شمالی پہاڑی سے لے کر مانک پور ریاست کے شمالی حدود تک دو سو تیس میل چوڑائی تھی، ان سب کا رقبہ ایک لاکھ اکہتر ہزار اسی ہیکٹر تھا۔[1]

داخلی انتشار اور خارجی حملوں، اندرونی بغاوتوں کی بنیاد پر جب دہلی میں مغلوں کا دبدبہ کم ہونے لگا، اور سلطنت مغلیہ کمزور ہوگئی تو بادشاہ محمد شاہ کے زمانے میں حکومت کا بچا کچھا دبدبہ بھی دم توڑ دیا تو پورے ملک میں افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا اور جگہ جگہ نیم خود مختار حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ نظام الملک اور علی دری خان جیسے لوگوں نے اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کرلیں اور نواب بن گئے، اسی زمانے میں

> ’’دہلی میں جب مغلوں کی حکومت چراغ سوئی کی طرح ٹمٹمانے لگی اور اس کی مرکزیت نے دم توڑ دیا، تو اس کا اثر فارسی زبان و ادب پر بھی پڑا مگر خود مختار قائم ہونے والی مختلف حکومتوں نے اس کی طرف بھرپور توجہ دی، اودھ کے حکمرانوں نے اور یہاں کے باشندوں نے فارسی زبان کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ چونکہ اس ریاست کے حکمراں فارسی زبان وادب کے عاشق زار تھے، اس لئے ان لوگوں نے اس زبان کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختصر سی مدت میں لکھنؤ فارسی زبان و ادب کا مرکز بن کر سامنے آیا۔ سرزمین اودھ کا ایک نایاب ہیرہ راجہ رتن سنگھ زخمیؔ اودھ کے نوابوں کی فارسی زبان وادب سے دلچسپی نے یہاں کے علمی وادبی فضا کو اس قدر خوشگوار بنا دیا کہ بلا تفریق مذہب وملّت لوگ فارسی زبان کو سیکھنے لگے، خاص کر ہندوؤں نے اس میں اتنی دلچسپی دکھائی کہ ان میں بہت سارے لوگ صاحب دیوان شاعر بہترین نثر نگار کالم نویس اور تذکرہ نگار پیدا ہوئے۔‘‘

میر محمد امین کو ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا، اور فیض آباد کو اودھ کی راجدھانی بنایا گیا، اودھ کے اس صوبے پر نوابوں کا کل دور تقریباً ۱۱۴ سال کا رہا۔ اس کے پہلے نواب میر محمد امین سعادت علی خان برہان الملک رہے، جبکہ آخری نواب نواب واجد علی شاہ رہے، جنھیں ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے حکومت سے بے دخل کر دیا اس طرح ۱۱۴ سال نوابین کے عہد کا خاتمہ ہوگیا۔

سرزمین اودھ پر فارسی زبان وادب کا فروغ:

دہلی میں جب مغلوں کی حکومت چراغ سوئی کی طرح ٹمٹمانے لگی اور اس کی مرکزیت نے دم توڑ دیا، تو اس کا اثر فارسی زبان وادب پر بھی پڑا مگر خود مختار قائم ہونے والی مختلف حکومتوں اس کی طرف بھرپور توجہ دی، اودھ کے حکمرانوں نے اور یہاں کے باشندوں نے فارسی زبان کی ترویج واشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ چونکہ اس ریاست کے حکمراں فارسی زبان وادب کے عاشق زار تھے، اس لئے ان لوگوں نے اس زبان کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختصر سی مدت میں لکھنؤ فارسی زبان وادب کا مرکز بن کر سامنے آیا۔ سرزمین اودھ کا ایک نایاب ہیرہ راجہ رتن سنگھ زخمیؔ اودھ کے نوابوں کی فارسی زبان وادب سے دلچسپی نے یہاں کے علمی وادبی فضا کو اس قدر خوشگوار بنا دیا کہ بلاتفریق مذہب وملت لوگ فارسی زبان کو سیکھنے لگے، خاص کر ہندوؤں نے اس میں اتنی دلچسپی دکھائی کہ ان میں بہت سارے لوگ صاحب دیوان شاعر بہترین نثر نگار کالم نویس اور تذکرہ نگار پیدا ہوئے اور ان کی علمی قابلیت کی بنیاد پر انھیں حکومتی عہدے بھی سپرد کئے گئے، انہیں علمی شخصیات میں سے ایک ذات راجہ رتن سنگھ زخمیؔ کی ہے۔

آپ ایک قادرالکلام شاعر، صاحب طرز ادیب، نکتہ شناس شارح، سند اور معتبر تذکرہ نویس اور علم نجوم کے ماہر تھے، آپ ہندی اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور قدرے انگریزی زبان بھی جانتے تھے۔

جائے پیدائش اور خاندانی پس منظر:

راجہ رتن سنگھ زخمیؔ کی پیدائش لکھنؤ کی سرزمین پر ہوتی، آپ ۲۳ محرم ۱۱۹۷ھ مطابق ۹ ستمبر ۱۷۸۲ء کو یکشنبہ کے دن پیدا ہوئے، آپ کے والد بالک رام نواب آصف الدولہ کے دور میں توپ خانے کے افسر تھے، آپ کے بارے میں فارسی تذکرہ نویس کے مصنف یوں رقم طراز ہیں:

” زخمیؔ در لکھنؤ در شب یکشنبہ ۲۳ محرم ۱۱۹۷ھ مطابق در دسامبر ۱۷۸۲ء میلادی چشم بدنیا کشود و در آغاز شباب شوق اکتساب علم بدلش افتاد بنابریں بعض زبانہائے مشہور و متداول مانند فارسی عربی و ہندی، سنسکرت، وانگلیسی را بقدر مایحتاج فرا گرفت و با علوم عقلیہ ونقلیہ دریں زبانہا آشنا شد“۲

راجہ رتن سنگھ زخمیؔ کے علمی کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی رسالہ معارف: میں یوں تحریر کرتے ہیں:

”منشی الملوک فخرالدولہ، دبیر الملک رتن سنگھ زخمیؔ جائے پیدائش لکھنؤ قوم کائستھ اس کا خاندان تین پشتوں سے دربار اودھ میں معزز عہدوں پر ممتاز تھا، رتن سنگھ بڑا فاضل تھا اور علامہ تھا“۳

راجہ رتن سنگھ زخمیؔ کی شاعری:

راجہ رتن سنگھ زخمیؔ ایک عظیم فن کار شاعر تھے انہوں نے دیگر زبانوں کے ساتھ فارسی زبان بھی سیکھی، یہ نہ دیکھا کہ اس کے استعمال کرنے والوں کی ذات اور ان کا مذہب کیا ہے، راجہ رتن سنگھ نے فارسی کو صرف ایک زبان سمجھ کر سیکھا اور اس پر عبور حاصل کیا، اور نثر ونظم میں بھرپور طبع آزمائی کی آپ اپنے زمانے میں سرزمین اودھ پر شعراء کے درمیان ایک عظیم مقام رکھتے ہیں اس کی وجہ یہ رہی کہ زخمیؔ فارسی زبان کے فطری شاعر تھے۔ شعروشاعری کا فن آپ کو وراثت میں ملا تھا۔ آپ کی خداداد صلاحیتوں کا اعتراف آپ کے معاصرین نے بھی کیا۔ آپ کو شعروشاعری پر کس قدر قدرت حاصل تھی اس کے بارے میں زیندر بہادر سری واستو یوں رقم طراز ہیں۔

” راجہ رتن سنگھ زخمیؔ ماہر اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے یہاں شگفتگی روانی دلکشی اور معنی آفرینی کی فراوانی ہے ان کے کلام میں متقدمین اور ہم عصر اساتذہ کے مضامین کا توارد اکثر پایا جاتا ہے۔“۴

کہتے ہیں عقلمند وہی ہوتا ہے جو دوسروں کے تجربے سے فائدہ اٹھاتا ہے، وہ راجہ رتن سنگھ زخمیؔ نے بھی اسی حکمت کا مظاہرہ کیا اور اپنے پیش روشوری کے انداز سے بہت کچھ سیکھا، آپ کے دیوان میں غزل کی کثرت ہے، اسی لئے غزل کی دنیا کے بے تاج بادشاہوں کے خزانوں سے بھرپور استفادہ کیا، وہ پیش روشعراء ان کی شعری روایتوں سے آپ نے بہت کچھ لیا، ان میں شیخ سعدی، شیرازی، حافظ اور امیر خسرو دہلوی کا نام قابل ذکر ہے۔ مذکورہ بالا شعراء کی غزلوں میں محبوب کے حسن، اس سے عشق ومعشوق کی ہے تو بھی اس کے لئے تڑپ کا تذکرہ آپ کو جا بجا ملے گا۔

یہ فارسی غزل کی خصوصیت ہے۔ اس میں معشوق جو ہوتا ہے۔ وہ ظالم فریب حیلہ باز، مکاری، صفا کی بے رحمی، بیدردی، بے اعتنائی کا مجموعہ ہوتا ہے، وہ عاشق کے شورش دل اور بے تابی کو جانتے ہوئے بھی اس پر ایک نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا، زخمیؔ نے پنی غزلوں میں اس کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ بطور نمونہ چند شعر ملاحظہ کریں:

ندانم کی بیگانہ یا اشنائی کہ
گہرا اشنائی گاہ نہ آشنائی
بمن عشق گفتی وشیر بندشنم
گمان برد بودم کہ نا آشنائی
برائے تو از خلق بیگانہ گشتم
تو ہم طرفہ نا آشنا آشنائی
زغم مردہ زخمیؔ ہمیں گفتہ گفتہ
فلانے کجائی فلانے کجائی۵

اس کے علاوہ زخمیؔ کے اشعار میں نغمگی اور ترنم جدت ادا، زبان کی لطافت، الفاظ کی شیرینی، سادگی کے باوجود فصاحت وروانی، تشبیہ واستعارہ کے ساتھ ساتھ جوش بیان بھی پایا جاتا ہے زخمیؔ کی شاعری میں خیالات کی دنیا دیکھنے کے بعد یہ کیا جا سکتا ہے کہ زخمیؔ جذبات کے بھی شاعر ہیں۔ زخمیؔ نے چھوٹے چھوٹے بحروں میں بھی شاعری کی اور اس میں وہ بہت کامیاب رہے، چھوٹے بحروں سے آپ کی بہت ساری غزلیں ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے رباعیات بھی لکھیں اور منقبتیں بھی لکھیں جس کو پڑھنے کے بعد قاری یہ کہہ اٹھتا ہے کہ حقیقت میں راجہ رتن سنگھ زخمیؔ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔

راجہ رتن سنگھ زخمیؔ کی فارسی نثر نگاری:

راجہ رتن سنگھ زخمیؔ صرف ایک شاعر نہیں تھے، بلکہ اپنے زمانے کے ایک عظیم نثر نگار ادیب بھی تھے، آپ نے جہاں شعروشاعری کے ذریعے فارسی زبان وادب کی خدمت کی وہیں نثر نگاری میں بھی اپنے عہد میں آپ اپنی مثال آپ رہے۔

حواشی:

۱- دی فرسٹ نوابس آف اودھ ص ۳۱، ۳۲ اور ۱۳۱ ۹ ڈاکٹر آشیروادی لال سریواستو
۲- تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان نقوی علی رضا سید، صفحہ ۵۲۶، ۵۳۱
۳- معارف نمبر ۲ جلد ۳ صفحہ ۶۳، ۶۴ جولائی ۱۹۱۸ء، رمضان سنہ ۱۳۳۶ء
۴- تذکرہ نویسی در ہندو پاکستان ص ۵۲۱، ۵۲۶ سید علی رضا نقوی
۵- دیوان زخمیؔ ص ۹۲ مطبع محمد لکھنؤ، سنہ ۱۸۷۳ء

❑❑❑

غزل

لپٹے ملیں گے سب کے بدن چھالٹین میں
اک روز دفن ہونا ہے کچی زمین میں

باطل سے حق ہمیشہ نبرد آزما رہا
یہ کشمکش ازل سے رہی کفر و دین میں

ایذا سے قبل آپ انہیں مار دیجئے
نفرت کے سانپ پالے ہیں جو آستین میں

یہ عہد کرنا چاہئے ہر عقل مند کو
حاصل کریں گے علم ملے خواہ چین میں

کرنے لگے پسند ترنم بجائے شعر
کتنا زوال آگیا ان شائقین میں

ناقدریٔ سخن نے یہ دن بھی دکھادئے
بیٹھے ہوئے ہیں ہم بھی صف سامعین میں

مخمورؔ اس کو نار جہنم جلائے گی
داخل ہوا ہے حلقۂ صد مرتدین میں

مخمورؔ کاکوروی
چودھری محلہ، کاکوری لکھنؤ
9450097929

غزل

میں اک پرندہ قید زمان و مکان کا
کرنا ہے تجربہ مجھے اپنی اڑان کا
خلقت سے اپنی ویسے تو میں مشتِ خاک ہوں
نسبت سے تیری فخر ہوں اس آسمان کا
میں صورتِ ہدف میں رہا زد پہ تیر کی
اور فصل برقرار تھا تیر و کمان کا
تارِ حیات سے بھی ہے نزدیک مجھ سے وہ
اطلاق اس پہ ہوتا ہے پھر لامکان کا
وہ اپنے گھر بُلا کے دیا ہے فریبِ نو
کیسے ادا کرونگا میں حق میزبان کا
وہ مجھ میں میری طرح سے تحلیل ہو گیا
باقی رہا نہ فرق کوئی درمیان کا
وہ میری ترجمانی کے ذوقِ سخن میں تھا
کھو بیٹھا اعتبار بھی لفظ و بیان کا
میں نا خدائے قلزمِ طوفانِ زندگی
کشتی کا خوف ہے نہ مجھے بادبان کا
میرِ سخن ہوں غالبِ مضمونِ غیب ہوں
شاعر ہوں ہر صدی میں، میں اُردو زبان کا
حد ہوگئی فرازؔ تری سرفرازیاں
سر کر گئیں ہیں معرکہ تیغ و سنان کا

فرازؔ رضوی
حیدرآباد
9959572516

غزل

نہ جانے کیوں وہ مجھ سے بدگماں ہے
بڑا دل سوز میرا امتحاں ہے

بس اس کی یاد میں دن کٹ رہے ہیں
بتا اے آسماں تو، وہ کہاں ہے

سبھی سے ہنس کے ملتا ہے برابر
سوا میرے ہر اک پر مہرباں ہے

نہ میکش ہیں نہ ساقی اور نہ ساغر
یہ میخانہ ہے یا اجڑا مکاں ہے

یہ ایسا دور ہے اہل زباں کا
نہ کوئی چاہنے والا نہ کوئی قدرداں ہے

تجھے دل میں بسایا جب سے ہم نے
ہوا دشمن ہمارا آسماں ہے

بیاں کیسے کروں احوال اپنا
غموں سے پر ہماری داستاں ہے

حمایتؔ موسم گل کا تصور کرکے دیکھا
لگاایسے کہ جیسے وہ یہاں ہے

ڈاکٹر حمایتؔ جائسی
۵۳۵/۲، سیکٹر ایچ، کرسی روڈ جانکی پورم لکھنؤ
9415394457

غزل

ظلم کی اُس نے انتہا کر دی
ناروا بات بھی روا کر دی

کاٹ دی ہے زبان تالو سے
حق کی آواز بے صدا کر دی

دل میں پوشیدہ کچھ نہیں رکّھا
میں نے ہر بات آئینہ کر دی

کیسی نادانی ہوگئی مجھ سے
میں نے پتھر سے التجا کر دی

کی محبت کی میں نے جو تبلیغ
اُس نے نفرت کی ابتدا کر دی

بند اُس نے دعا سلام کیا
میں نے ایسی بھی کیا خطا کر دی

جو تھا آمادہ دشمنی پہ مری
میں نے اُس کے لئے دعا کر دی

رب کی مرضی پہ جو چلا ہے ظفرؔ
اس کی آسودگی عطا کر دی

ظفر اقبال ظفرؔ
۱۷۰، خیلدار، فتح پور (یوپی)
7979512431

غزل

شکستہ رشتہ ہوا ہے تو آن بان کہاں
کھلی فضا میں ہوں تو سر پہ سائبان کہاں

بھنور کے ساتھ ہی رہتا ہے مشغلہ اس کا
شکستہ کشتی کیسے حصے میں بادبان کہاں

ہمارے سینے میں اترے ہیں نفرتوں کے سبق
ہمارے لب پہ محبت کی داستان کہاں

ہر ایک شخص ہی ٹوٹا ہوا ہے اندر سے
غموں کو بانٹنے والا پُرش مہان کہاں

مہک اٹھا تھا جو اس کی وفا کی خوشبو سے
وہ پُر بہار محبت کا اب مکان کہاں

جو اپنے آپ ہی رکھتا ہو آئینے کی صفت
اب ایسا شخص سراج مرے درمیان کہاں

سراج سکینہ
سنگم اسکول بلڈنگ، ڈالی گنج، پورٹ بلیئر
9679567384

غزل

فضاؤں میں دھواں کب تک رہے گا
سلگتا ہر مکاں کب تک رہے گا

یہاں ہے ہر طرف دلدل ہی دلدل
یہ آخر امتحاں کب تک رہے گا

سکوں اک پل کو بھی ملتا نہیں ہے
دل اتنا بیقراں کب تک رہے گا

درختوں کا کوئی سایہ نہیں ہے
پر تپتا سائباں کب تک رہے گا

مری بستی سے شعلے اٹھ رہے ہیں
یہاں کا ر زیاں کب تک رہے گا

بہت مجبور ہیں بستی کے رہبر
یہ دست تنگ داں کب تک رہے گا

سکوں کا شاذیہؔ ہر لمحہ نہیں ہے
یہ دل آتش فشاں کب تک رہے گا

شاذیہ خان
لکشمن داس بلڈنگ، نشاط گنج، لکھنؤ
8887984564

اشفاق برادر

مکان نمبر ۱۵ / ۱۳۲، بابو پور وہ کانپور

7499646978

افسانہ

مجھے یقین ہے کہ.....

دیکھو میری جانب اور بات سنو............

میں اس وقت تمہاری کوئی بھی بات نہیں سنوں گا.................کیوں؟............کیوں کا بھی جواب نہیں دوں گا؟۔ تمہاری یہ حرکت مجھے بالکل پسند نہیں............

نہ ہو...............کیا میں اپنے بال نوچنے لگوں..................بھلا تمہاری مرضی میں، دخل کیوں دوں؟............جہنم میں جاؤ۔ یہ کہتے ہوئے بیگم سلمیٰ کمرے سے باہر ہو گئیں............

میں جان چکا تھا کہ سلمیٰ کی بھابھی سے موبائل پر کیا باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے دہلی نہیں جانا تھا کیونکہ میرا ہاتھ اس وقت بہت تنگ تھا پچھلے ماہ ہی ہم سبھی دہلی شادی میں گئے تھے۔ سب کے نئے۔ نئے کپڑے بنے تھے، دس جوڑے کپڑے دینے کے واسطے لیے گئے، آنے جانے کا ریزرویشن ٹکٹ، خرچ کے لیے الگ پیسے، ایک نوکری پیشہ کے لئے بڑا بوجھ تھا۔ جس شعبے میں تھا وہاں رشوت، گفٹ نہیں تھا سوکھی تنخواہ تھی اس پر دو بچوں کی پڑھائی کا خرچ یعنی قبر کا حال مردہ ہی جانے، اس پر بیگم سلمیٰ کی فرمائش۔ بس اب بہت ہو گیا اب کچھ نہیں۔

بھابھی نے کل رات پھر مجھے کال کیا۔ جی بھابھی، سلمیٰ سے کیوں بات بند کر رکھی ہے، بھابھی۔ میں تو بات کر رہا ہوں وہی نہیں مخاطب ہوتی، کوئی مار پیٹ..........نہیں، بالکل نہیں، اس زمانے میں بیوی سے کون مار پیٹ کرے گا، بنا بات کے ہی بات نکالتی ہے سلمیٰ..........پھر بول چال کیوں نہیں ہے۔ اب کیا بتاؤں بھابھی ابھی پچھلے مہینے تو ہی دہلی شادی میں ہم سبھی آئے تھے اچھا خاصہ خرچ ہوا۔ اس وقت ہاتھ تنگ ہے اور سلمیٰ کہہ رہی ہے پھر دہلی چلنا ہے منیرہ کے بیٹے کی چھٹی میں بھلا بتاؤ بھابھی، پیسہ درخت میں تو پھلتا نہیں..........سلمیٰ میں سوجھ بوجھ کی کمی ہے دوسروں کو دیکھتی ہے اپنے کو نہیں۔ اور بھابھی بول رہی تھیں۔ جاوید میاں۔ رشتے داری نبھائی جاتی ہے پھر بہن۔ بہن کا معاملہ ہے، یہ کوئی بتانے کی بات تھوڑی ہے یہ کہہ کر بھابھی نے موبائل کال کاٹ دی اور میں سر تھام کر بیٹھ گیا..........باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں اب عزیز و اقارب میں شرارت بھرے لب و لہجے کو فروغ دیا جائے گا۔ معاملات تو کوئی سمجھے گا نہیں مختلف باتیں، ایک ذراسی بیوقوفی میں زمین پر جھاڑ جھنکاڑ..........اب کیا کروں؟

صبح ہی میں اپنے دوست ہاشم کے پاس پہونچا۔ میری شکل دیکھ کر ہی ہاشم ہنسنے لگا۔ ابے، چہرہ کیوں بگڑا ہوا ہے، کیا بتاؤں یار؟۔ عورت اور رشتے داروں سے پریشان ہوں۔ کوئی نئی بات بتا یہ تو سبھی کے ساتھ لگا رہتا ہے، خود کو ہلاکت میں کیوں ڈال رہا ہے، زہر پینے سے ڈر مت۔ راستہ نکال، راستہ، سب درست ہو جائے گا..........بول کیا بات ہے؟ یار۔ سلمیٰ کو دہلی اس کی بہن منیرہ کے پاس بھیجنا ہے مجھے دس ہزار کی سخت ضرورت ہے۔ روپیہ تو یہ لے مگر بے جا مت خرچ کر، تو تو سلمیٰ کے مزاج کو جانتا ہے۔ ہوں۔ ایک لمبی سی سانس باہر چھوڑی۔ جاوید تو میرا یار ہے بچپن کا دوست ہے سلمیٰ کو پیار سے سمجھا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ناشتہ کر لے پھر جانا۔ یونہی نہار منہ گھر سے نکلا ہوگا۔ نہیں ہاشم، مجھے جانے دے، بیٹھ۔ بیٹھ۔ روبی ناشتہ لے آؤ جاوید کیلئے..................

سلمیٰ۔ یہ لو دس ہزار جو ہاشم سے مانگ کر لایا ہوں اور یہ دو ہزار میرے پاس ہیں تیاری کرو دہلی جانے کی۔ یہ کہہ کر جاوید نے اپنا بیگ سنبھالا اور آفس کے لئے نکل گیا۔ سلمیٰ نے ٹفن بھی نہیں تیار کیا تھا۔ جاوید آفس تو پہونچ گیا لیکن اس کا دل و دماغ کام میں لگ نہیں رہا تھا۔ لنچ ٹائم میں چپراسی سے اس نے کینٹین سے کھانا منگوا کر کھایا۔ بغل والی سیٹ پر بیٹھے شرما جی کی آنکھیں مسکرا رہی تھی مگر جاوید کے خیالات خود شور مچا رہے تھے۔

''پہلے بچے کی پیدائش پر میں نے سلمیٰ سے کہا کہ منیرہ کو بلوا لو بچہ ہاسپٹل میں ہو جائے گا۔ آسانی اور کم خرچے میں کام ہو جائے گا۔ جان پہچان اور بھروسے کا ڈاکٹر ہے بات بھی کر رکھی ہے لیکن منیرہ کے آتے ہی نرسنگ ہوم کی بات ہونے لگی، میں کیا کہتا بہن نے نرسنگ ہوم میں زچگی کی بات سمجھا دی اور پھر نرسنگ ہوم میں آپریشن سے بچہ پیدا ہوا۔ ستر ہزار کا بل بنا۔ میرے تو پیروں تلے زمین نکل گئی ادھر ادھر کر کے بل ادا کیا گیا۔ بہرحال کافی دقتوں کے بعد حالات پٹری پر آئے پھر دوسرے بچے میں تیس کے قریب خرچ ہوا مجھے کچھ سکون ہوا۔ میری ساس نے کافی میوہ اور حلوہ بنوا ڈالا۔ میں کہتا رہا یہ بہت زیادہ ہے، میری ساس کا کہنا تھا کہ ناطے رشتے داروں اور پاس پڑوس میں بھی بھجواؤ گے یا نہیں، لوگوں کو بھی تو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم بھی سماج میں حیثیت رکھتے ہیں۔ کل ملا کر میری جیب خالی ہی نہیں مقروض ہو گئی۔ سلمیٰ نے ان معاملات پر ایک لفظ بھی نہیں بولا بلکہ اپنی ماں کی ہاں میں ہاں ہی ملاتی رہی۔''

جاوید کے ذہن میں پرانی ہواؤں کا زور تھا۔شادی سے پہلے جاوید کی زندگی میں کوئی خاص ہلچل ،کوئی رنگ نہیں تھا۔سیدھا سادھا انداز تھا۔ ہاں جاوید میں نفاست بہت تھی۔ ماں اکثر کہا کرتی تھی۔جاوید بیٹا، دنیاداری کی طرف بھی دھیان دیا کرو۔سب کچھ ایک سا کبھی کسی کے ساتھ رہا نہیں ہے۔خزاں کے ساتھ بہار ہے اور بہار کے ساتھ خزاں بنی رہتی ہے۔ بیٹا، ہم نے غریبی کے ساتھ تم کو تعلیم دلوائی ہے تمہارا ہر قدم منزل کی جانب بڑھتا رہے، میری یہ دعا ہے۔

جاوید نے نوکری پائی، ہزاروں افراد کو پچھاڑ کر کمپٹیشن سے آیا، ماں کی دعائیں، آسمان والے کی عنایت جاوید کے ساتھ۔سلمیٰ ایک دور کے رشتے میں کزن تھی اور ماں کے سامنے ہی جاوید کی سلمیٰ ہوگئی، جاوید بہت خوش ہوا سلمیٰ کو دیکھ کر، ماں تو سب سے زیادہ جیسے اس کی دلی مراد پوری ہوگئی ہو ماں چند مہینوں کے بعد ہی اس سفر پر چلی گئی جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا ہے۔ماں کی کمی جاوید کو ہر پل یاد آتی اور اکثر سلمیٰ سے اس بات کو لے کر تکرار ہوتی رہتی کہ ہر وقت ماں۔ماں کو یاد کیوں کرتے رہتے ہو جو بھی دنیا میں آیا ہے اس کو بہر حال ایک وقت کے بعد جانا ہی ہے، جاوید کہتا کہ میری ماں ہے، میں نہیں یاد کروں گا تو کون یاد کرے گا، تم تو کرنا نہیں۔بس تکرار شروع ہو جاتی۔ ہفتہ دس دن زندگی جہنم بنی رہتی۔ ہاشم یا پھر روبی بھابھی کہہ سن کر، پچکار کر بول چال شروع کرواہی دیتی تھیں۔

سلمیٰ، ہر وقت اپنی تعریف کی بھوکی رہتی۔اچھائی بتا کر یوں بھی لوگ اپنا کام بنانے کو ہنر مندی کہتے ہیں، لباس، چوڑی، چپل، پرفیوم، میک اپ دوسرے کا ہی اچھا لگتا ہے، سلمیٰ بیگم کو۔میں لاکھ بتاؤں، سمجھاؤں مگر بے یقینی کے بادل چھائے ہی رہتے، میں بھی کچھ نہیں کہتا مگر جب تھک جاتا تو برسات کی طرح معاملہ ہو جاتا.................سلمیٰ میں ایک بات کی خوبی تو ہے کہ وہ زیورات کے بارے میں کوئی فرمائش نہیں کرتی، کبھی کبھی سُنار کے یہاں جا کر زیورات کے ڈیزائنوں میں اُلٹ پھیر کرا آتی تھی جب مجھ سے بتاتی تو میں کہہ اٹھتا ایک دن سارے زیورات خراب ہو جائیں گے۔کیونکہ سنار جو بھی زیور بناتا ہے اس میں ٹانکا ضرور لگاتا ہے۔اور سلمیٰ کو چاہے جتنا سمجھاؤ اس کو کرنا اپنی ہی ہے۔

پہلے بچے کی پیدائش پر میں نے سلمیٰ سے کہا کہ منیرہ کو بلوا لو بچہ ہاسپٹل میں ہو جائے گا۔آسانی اور کم خرچے میں کام ہو جائے گا۔جان پہچان اور بھروسے کا ڈاکٹر ہے بات بھی کر رکھی ہے لیکن منیرہ کے آتے ہی نرسنگ ہوم کی بات ہونے لگی، میں کیا کہتا بہن نے نرسنگ ہوم میں زچگی کی بات سمجھا دی اور پھر نرسنگ ہوم میں آپریشن سے بچہ پیدا ہوا۔ستر ہزار کا بل بنا۔میرے تو پیروں تلے زمین نکل گئی ادھر ادھر کر کے بل ادا کیا گیا۔ بہر حال کافی دقتوں کے بعد حالات پٹری پر آئے پھر دوسرے بچے میں تیس کے قریب خرچ ہوا مجھے کچھ سکون ہوا۔میری ساس نے کافی میوہ اور حلوہ بنوا ڈالا۔میں کہتا رہا یہ بہت زیادہ ہے، میری ساس کا کہنا تھا کہ ناطے رشتے داروں اور پاس پڑوس میں بھی بھجواؤ گے یا نہیں، لوگوں کو بھی تو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم بھی سماج میں حیثیت رکھتے ہیں۔کل ملا کر میری جیب خالی ہی نہیں مقروض ہوگئی۔سلمیٰ نے ان معاملات پر ایک لفظ بھی نہیں بولا بلکہ اپنی ماں کی ہاں میں ہاں ہی ملاتی رہی۔

میرا تو حال گدھے پر ڈھیر سا بوجھ جیسا ہی تھا۔خیر میں ہاں، ہوں کرتا ہوا زندگی کو ڈھوتا ہی رہا۔ سب سے اہم بات یہ ہو جاتی کہ مجھے کبھی کبھی خود بھی اپنا ناشتہ، کھانا بنانا اور کپڑے دھونا پڑتا تھا۔دیکھ نہیں رہے ہو دو۔دو بچوں کو پال رہی ہوں، کتنی مصروف رہتی ہوں، تم کو تو کچھ فکر رہتی نہیں۔دیکھو سوکھ کر کانٹا ہوئی جا رہی ہوں۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایک کام کرنے والی ہی رکھ لیں، جاڑے میں ہاتھ پیر سن ہو جاتے ہیں اور گرمی میں جلنے لگتے ہیں، منیرہ کے یہاں دو۔دو ہیں اور ہمارے یہاں ایک بھی نہیں، تم کو تو کوئی پرواہ ہی نہیں۔سلمیٰ۔جو ایک بار شروع ہوگئی تو بس شروع۔کتنی دیر بجے گی معلوم نہیں۔

میں ان حالات میں جتنی جلدی ہو گھر سے باہر نکل جانے کی سوچتا رہتا، منتشر ذہن سکون چاہنے کی تلاش میں ادھر اُدھر مارا۔مارا گھومنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔شاید میرے لئے گھر میں سکون نہیں تھا لیکن میں مایوس نہیں ہوں جب بچے بڑے ہونگے یا کچھ ایسا ہوگا جو میرے علم میں اس وقت نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ حالات ضرور بدلیں گے۔

❏❏❏

غزل

جیسے جسموں کو چتائیں کھا گئیں
زندگی کو یوں بلائیں کھا گئیں

کھا گیا انساں گپھاؤں کا وجود
اور تمدن کو گپھائیں کھا گئیں

گزرا بچپن جس کے سائے میں مرا
وہ شجر بوڑھی ہوائیں کھا گئیں

پاؤں میں اب آبلے پڑتے نہیں
ریگِ صحرا کو گھٹائیں کھا گئیں

بھوک اور افلاس نے وہ دن دکھائے
اپنے ہی بچوں کو مائیں کھا گئیں

ابن یعقوب آئے گا اک دن ضرور
بالیاں گیہوں کی گائیں کھا گئیں

کیا ستم ہے خود مری ہی ذات کو
گنبدِ جاں کی صدائیں کھا گئیں

روح! عصیاں کی غلاظت میں ہے فرق
جسم! ریشم کی قبائیں کھا گئیں

کیسے نجمی ؔ وہ کرے گا دوستی
جس کو یاروں کی وفائیں کھا گئیں

عرفان نجمی
کرنیل گنج، کاغذی محال، کانپور
8957550267

ڈاکٹر عبدالغفار فاروقی

گلی حکیم بشیر، پاٹانالہ، چوک، لکھنؤ

9415576584

افسانہ

میری بیٹی

کملا کے گاؤں ہر چند پور میں آج خون کے عطیہ کا کیمپ لگا تھا۔اس گاؤں کے آس پاس گاؤں میں بھی اس کا بہت چرچا تھا۔کملا ہمیشہ سے ہی فلاحی وسماجی کاموں خاص کرلڑکیوں کی تعلیم کے کاموں میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔اس لیے آج بھی اس نے سب سے پہلے اپنے خون کا عطیہ پیش کیا۔وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ خون کے عطیہ سے ایک مجبوراور ضرورت مند کی جان بچانے کے ساتھ ساتھ خود انسان کے جسم میں خون کی روانی بھی بڑھ جاتی ہے۔خون کا عطیہ دے کر باہر نکلی ہی تھی کہ پڑوسن سریتا نے بتایا کہ سرپنچ صاحب بلا رہے ہیں تیری چھوری کے بارے میں کوئی بات کرنی ہے۔کملا سمجھ نہیں پائی کہ آخر ایسا کیا کر دیا میری چھوری نے! اس کو تو جیسے خاموشی نے جکڑ لیا........... کچھ پل وہ وہیں خاموش بیٹھ گئی۔بٹیا شہر پڑھنے گئی ہوئی تھی اس کو آنے میں ابھی گھنٹہ بھر باقی تھا۔برگد تلے چھاؤں میں بیٹھ کر وہ من ہی من سوچنے لگی آخر میری ارمانوں کی بچی نے کیا غلط کر دیا۔ہم نے تو اس کو اتنی محنت سے پڑھایا لکھایا، پالا۔پوسا کہیں کچھ غلط...........!

ایسے میں اکثر اچھے خیال تو آتے ہی نہیں۔اور وہ کیا۔کیا سوچتے۔سوچتے ۲۹ سال پیچھے چلی گئی جب وہ خود بچی تھی اور اسکول جانے کا خواب دیکھتی تھی۔کہ وہ بھی بستہ لے کر اسکول جائے گی یونیفارم پہنے گی اور پھر خوب پڑھ لکھ کر سماج میں نام پیدا کرے گی۔اس کے گھر کا ماحول لڑکیوں کی تعلیم اوران کی آزادی کا قائل نہ تھا۔بس اسی مجبوری نے اسکی اس خواہش کو پورا ہونے نہ دیا۔

اس لیے اسے گھر کی چہار دیواری کے اندر قید ہو کر چولہا چوکا ہی سنبھالنا پڑا۔بہت جلد اس کی پڑوس کے گاؤں میں شادی بھی کر دی گئی اور جو ابھی تک کم سے کم گھر کی چہار دیواری میں ہی سہی سوچنے۔سمجھنے، رہنے۔سہنے کی تو آزادی حاصل تھی۔اسے بھی اب چھین لیا گیا تھا۔اب اس کی ہر سوچ وفکر، اٹھنے۔بیٹھنے، کھانے۔پینے پر ساس وشوہر کا پہرا لگ گیا تھا۔یہاں وہ بغیر سسرالیوں کی مرضی کے کوئی کام کاج نہیں کر سکتی تھی۔وہ دن تو وہ کبھی بھول ہی نہ سکتی تھی جب اس کو پتہ چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔اوراس کی ممتا کی نشانی اسے حاصل ہونے والی ہے۔ڈاکٹری چیک اپ کے بہانے شوہر کے ذریعہ غیر قانونی طریقے سے حمل کی جانچ کرا لی گئی۔جانچ میں پتہ چل گیا تھا کہ اس کے پیٹ میں پلنے والی لڑکی ہے۔پھر کیا تھا قیامت برپا ہو گئی تھی، کتنا دباؤ پڑا تھا اس پر کہ وہ حمل کو ضائع کروا دے پر وہ بالکل اڈگ بنی رہی۔سسرال کی طرف سے آنے والے ہر حملے کو جھیلنے کے لئے تیار ہو گئی۔پتہ نہیں اس میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ وہ اپنی پوری سسرال سے لڑ پڑی، اس نے بچہ نہ گرانے کی قسم کھائی اور ہر حالت میں اس کو زندہ وجود میں لانے کا فیصلہ کیا۔اس کے مجازی خدا سمیت سبھی سسرال والے اس فیصلے کے بعد سے ہی اس سے کٹے کٹے رہنے لگے۔مانو اس نے کوئی بہت بڑا جرم کر دیا ہو۔۔۔۔۔۔

آس پڑوس کی بوڑھیاں اس کو سمجھانے آتیں کہ ضد چھوڑ دو لڑکی کی زندگی کوئی زندگی نہیں۔سب لوٹنے کو تیار بیٹھے رہتے ہیں، کیسے پالے گی تو اسے؟ محلے کی عورتیں اس کا حوصلہ پست کرنے کے لیے پوری کوشش کرتیں۔پر وہ چپ چاپ سنتی رہتی۔اس پورے مسئلے میں نہ اس کی ساس اسکے ساتھ رہی اور نہ اس کے مجازی خدا نے اس کو کوئی سہارا دیا۔غضب تو یہ ہوا کہ ایک بار اس کا شوہر بدھوا، اسی بات پر ناراض ہو کر اسکو میکے چھوڑ آیا۔بدھوا نے یہ حربہ اس لیے استعمال کیا کہ اس سے کملا کے گھر والے بھی اس کے ہم خیال ہو جائیں گے، کیونکہ جب لڑکی شادی کے بعد سسرال والوں کی ناراضگی کے ساتھ میکہ آتی ہے تو یہ لڑکی کے ماں باپ کے لیے ناسور کے مترادف ہوتا ہے۔ یہاں گاؤں والوں کی کچھ انسانیت جاگی اور انہوں نے کسی طرح صلح سمجھوتے کے ذریعہ اسے دوبارہ سسرال کی دیہری پار کرائی۔

اتنا ہی نہیں ایک دن پھر کملا کی ہمت تب جواب دے گئی جب اس کی پڑوسن شویتا، ضروریات زندگی کے لیے صبح کھیت گئی تھی اور کسی انسانی درندے نے اس کو اپنی ہوس کا شکار بنا لیا تھا۔مارے شرم کے اس شویتا نے خودکشی کر لی تھی۔یہ سن کر تو اس کو سکتہ ہی طاری ہو گیا تھا۔اسی رات اس نے ایک عجیب خواب بھی دیکھا تھا، مانو اس کی ہونے والی بیٹی اس سے کوکھ میں باتیں کر رہی ہو۔کہہ رہی ہو کہ ہے ماں، سن ماں! ماں! سن ماں، مجھے روک لے اس جالم (ظالم) دھرتی پر آنے سے، بدنصیبی اپنانے سے۔

”زندگی کو بنا کر پھولوں کی بغیا ذرہ ذرہ مہکائیں گے۔تو آ تو صحیح، تجھ کو پیار، محبت، حوصلہ کا سبق پڑھا کر تیری روشن دنیا کو پروان چڑھائیں گے۔تو ایک بار آ تو صحیح تیرے لیے زمانے کو جنت بنائیں گے۔جنت بنائیں گے........... اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔اس کے من میں نہ پڑھ پانے کی جو ٹیس تھی، جو درد تھا وہ آج انقلاب کی صورت میں بدل چکا تھا۔اس کے آگے بس ایک ہی منزل تھی کہ اپنی بچی کو پڑھانا ہے، کیونکہ پڑھائی ہی روشن مستقبل کی بنیاد اور بلند حوصلوں کی ضامن ہے۔پڑھائی کے ساتھ ساتھ اسے ایسے خیالات احساسات وآرزوئیں بھی دینا ہیں جس سے وہ ملک وملت کے لیے کچھ کر سکے۔یہی سوچ کر اس نے اس کا نام بھارتی رکھا تھا۔تبھی وہاں بچے آ کر کھیلنے لگے اور اس کا دھیان بھٹک گیا۔وہ اٹھی اور وہاں سے سرپنچ کے گھر کی طرف چلنے لگی۔اس کا دماغ ہچکولے کھا رہا تھا، سو سو طرح کی باتیں ذہن کو پریشان کر رہی تھیں۔آخر بات کیا ہوئی ہوگی؟ کس لیے بلایا ہے سرپنچ نے؟ دور تک خالی کھیت ہی کھیت تھے۔وہ پگڈنڈی پر اکیلی ہی سوچتی ہوئی جا رہی تھی، اپنی طرف سے تو اس نے بہت اچھے سنسکار (اخلاق) دیے تھے جب بھی ٹیلی ویژن پر کوئی اچھی اخلاقی کہانی دیکھی۔سنی، اپنی بیٹی کو ضرور سنائی۔“

میں نے تجھے دیکھا ہے اپنے دل کی آنکھوں سے۔اداس، پریشان، بے بس اور نا امید۔سو سو آنسو روتے اور بلکتے، اپمان (ذلت) کے گھونٹ پیتے اور سہتے..........ماں! سن ماں، مجھے روک لے میں آنا ہی نہیں چاہتی ایسی دھرا پر جہاں نہ مان (عزت) ہے نہ سمّان (عظمت)۔سب پتھر دل انسان! ہوس کے بھوکے بھیڑیے۔ ہر پل بس نوچنے گھسوٹنے کو تیار..........

روک لے ماں، روک لے! اب کملا سے رہا نہ گیا۔اس کی دریائی ممتا بھری آنکھوں سے آنسوؤں کی موجوں نے روانی اختیار کرتے ہوئے بولنا شروع کیا۔بٹیا تو آنا، مت گھبرانا۔تو ہی تو میری ہمت اور آشا (امید) ہے۔میرے کل کی روشنی و سہارا اور ہل چل ہے۔اپنے حوصلوں اور ہمت سے زندگی کا ایک رخ موڑ لائیں گے اور مستقبل کو خوشحال و پرسکون بنائیں گے..........

زندگی کو بنا کر پھولوں کی بغیا ذرہ ذرہ مہکائیں گے۔تو آ تو صحیح، تجھ کو پیار، محبت، حوصلہ کا سبق پڑھا کر تیری روشن دنیا کو پروان چڑھائیں گے۔تو ایک بار آ تو صحیح تیرے لیے زمانے کو جنت بنائیں گے۔ جنت بنائیں گے..........اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔اس کے من میں نہ پڑھ پانے کی جو ٹیس تھی، جو درد تھا وہ آج انقلاب کی صورت میں بدل چکا تھا۔اس کے آگے بس ایک ہی منزل تھی کہ اپنی بچی کو پڑھانا ہے، کیونکہ پڑھائی ہی روشن مستقبل کی بنیاد اور بلند حوصلوں کی ضامن ہے۔پڑھائی کے ساتھ ساتھ اسے ایسے خیالات احساسات و آرزوئیں بھی دینا ہیں جس سے وہ ملک و ملت کے لیے کچھ کر سکے۔یہی سوچ کر اس نے اس کا نام بھارتی رکھا تھا۔تبھی وہاں بچے آ کر کھیلنے لگے اور اس کا دھیان بھٹک گیا۔وہ اٹھی اور وہاں سے سرپنچ کے گھر کی طرف چلنے لگی۔اس کا دماغ ہچکولے کھا رہا تھا، سو سو طرح کی باتیں ذہن کو پریشان کر رہی تھیں۔آخر بات کیا ہوئی ہوگی؟ کس لیے بلایا ہے سرپنچ نے؟ دور تک خالی کھیت ہی کھیت تھے۔وہ پگڈنڈی پر اکیلی ہی سوچتی ہوئی جا رہی تھی، اپنی طرف سے تو اس نے بہت اچھے سنسکار (اخلاق) دیے تھے جب بھی ٹیلی ویژن پر کوئی اچھی اخلاقی کہانی دیکھی۔سنی، اپنی بیٹی کو ضرور سنائی۔تو پھر آج!

کچھ دن پہلے اس نے افغانی بہادر لڑکی ملالہ کے بارے میں سنا تھا۔یہ بھی کہ ملک کی کوئی بیٹی خلاء میں جا رہی ہے۔کوئی کھیلوں میں سونے کا تمغہ جیت کر لا رہی ہے۔کوئی ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی کو سر کر رہی ہے۔

ان سب میں خود اعتمادی کی کمی نہ تھی۔ان سب کے حوصلے بلند تھے۔یہ سب دیکھ کر کملا کو لگتا تھا وہ سب ٹھیک کر رہی ہے۔اس کو یقین تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی پرورش ٹھیک طریقے سے اور صحیح سمت میں کر رہی ہے۔پر کبھی لگتا تھا شاید کوئی کمی رہ گئی ہو کیوں کہ ہے تو وہ اَنپڑھ جاہل ہی۔ بھلے کتنی ہی مصیبت جھیل کر اس نے اپنی بیٹی کو پڑھایا اور پروان چڑھایا ہو۔یہی سوچتے سوچتے وہ سرپنچ کے گھر پہنچ گئی۔سرپنچ دوسرے پنچوں کے ساتھ پیڑ کے نیچے ہی کھٹیا ڈالے بیٹھے تھے۔کملا بھی رام رام کرتی ہاتھ جوڑ کر وہیں کھڑی ہو گئی۔سرپنچ کملا کو دیکھتے ہی بولے، ’’تیری چھوری سے تو ایسی امید نہ تھی‘‘ کملا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، کیا ہوا ہوگا؟ پنچ بھی سرپنچ کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے سرپنچ بولے، ’’ایسی لڑکی نہ دیکھی میں نے پورے کو ہلا پور میں‘‘ کملا نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا، ’’کیا ہوا سرپنچ جی مہاراج! بٹیا سے کوئی گلتی (غلطی) ہو گئی؟‘‘ اس پر سرپنچ جی زور زور سے ہنسے اور بولے، ’’تیری لڑکی نے تو ریکارڈ توڑ دیا پورے کو ہلا پور میں سب سے زیادہ نمبر لائی ہے، فرسٹ آئی ہے بارہویں میں!‘‘ سرپنچ جی کی خوشی ان کے چہرے سے صاف جھلک رہی تھی۔ وہ پھولے نہیں سما رہے تھے، اپنے گاؤں کا نام روشن ہونے پر، انہوں نے فیصلہ لے لیا۔’’بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ مہم کو بڑھاوا دینے کی خاطر کملا کی بیٹی کو گاؤں کا ایک دن کے لیے سرپنچ بنانے کا۔اسی کے بعد انہوں نے فیصلہ سنایا اب کی ۱۵/ اگست کو ملک کی آزادی کے دن بھارتی بٹیا گاؤں میں دیش کا ترنگا پھیرائے گی!‘‘

کملا کو تو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب سچ ہے۔اس کا من مارے خوشی کے اچھلنے لگا۔اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکلنے لگے۔تبھی اس نے دیکھا کہ اس کی لاڈلی بھارتی بیٹی بھی بھاگی بھاگی وہیں آ رہی ہے۔آتے ہی وہ ماں سے لپٹ گئی اور پھر سرپنچ اور سبھی پنچوں کی دعائیں لیں۔جب بھارتی کو پتہ چلا کہ وہ ایک دن کی سرپنچ بنائی جا رہی ہے اور ۱۵/ اگست کو اپنے گاؤں میں جھنڈا پھیرائے گی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔آج وہ پڑھائی کی اہمیت کو جان گئی تھی۔اس کی ماں نے اس کی پڑھائی کے لیے جو قربانی دی تھی اسے یاد کر کئی بار اس کی آنکھیں بھی نم ہوئی جا رہی تھیں۔وہ سوچ رہی تھی اگر اس کی ماں ہمت و حوصلہ نہ دکھاتی تو اس کا اس ظالم دنیا میں آنا ہی ناممکن تھا..........ماں کی ہمت کی وجہ سے ہی اس نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں اور پھر ماں کی بہادری ہی تھی کہ انہوں نے اس کی پڑھائی پر بہت زور دیا۔خود انپڑھ ہوتے ہوئے بھی اس نے پڑھائی کی اہمیت کو اس کے سامنے اجاگر کیا۔

مانو دن پر لگ کر اڑ گئے ہوں اور وہ حسین دن بھی آ گیا جس دن اسے اپنے دیش کا ترنگا پھیرانا تھا۔سچ پوچھو تو ساری رات اسے نیند ہی نہیں آئی۔اتنا خوش جو وہ تھی۔وہیں بھارتی کی ماں بھی بہت زیادہ بے صبری ہو رہی تھی اس دن کے لئے۔بھارتی کو اس دنیا میں نہ دیکھنے کی خواہش رکھنے والے اور لڑکی کو بوجھ سمجھنے والے اس کے باپ اور اس کی دادی بھی اس پروگرام میں جانا چاہتے تھے پر بھارتی کا سامنا نہیں کر پا رہے تھے۔ اور نہ ہی ان کی ہمت پڑ رہی تھی۔انہیں آج اپنی ظالم سوچ پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔وہ لوگ سوچ رہے تھے کہ کاش انہوں نے بھی بھارتی کی ماں کا ہمیشہ ساتھ دیا ہوتا! بیٹی کی اہمیت کو سمجھا ہوتا، تو آج انہیں اتنے بڑے خوشی کے انمول پلوں میں یوں مایوس نہ بیٹھنا پڑتا۔وہ سوچ رہے تھے ان کے دو بیٹے بھی تو ہیں۔دونوں نے کیا کیا؟ ایک نے تو پانچویں کے بعد اور دوسرے نے آٹھویں کے بعد پڑھائی چھوڑ دی۔ہم نے ان کے لیے کیا نہیں کیا۔کھلانے۔پلانے، کپڑے۔لتے سبھی میں تو ہم نے بھارتی سے زیادہ ان لڑکوں کے ساتھ کیا۔ماں پر بھی الزام لگایا کہ تم بیٹی سے زیادہ محبت کرتی ہو، بیٹوں سے نہیں۔یہ سب جھوٹ تھا۔وہ سب کو برابر چاہتی تھی۔وہ تو ماں تھی۔اس کو ہم نے کبھی ان لڑکوں کی غلطی پر ڈانٹنے تک نہ دیا۔مگر اس کا کیا نتیجہ نکلا وہ دونوں بدتمیز ہو گئے۔اور کسی کی نہیں سنتے۔آوارہ گھوم رہے ہیں۔کیا کریں گے آخر یہ لوگ اپنے آگے کی زندگی میں؟ وہ سوچ ہی رہے تھے کیا کرنا چاہیے؟ تبھی بھارتی کمرے میں آئی اور بولی جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم سب کو وہاں چلنا ہے۔ بھارتی کا اتنا کہنا تھا کہ بھارتی کے باپ اور دادی کا جذبات کی آندھی سے من بھر آیا۔اس سے معافی مانگنے لگے کہ ہمیں معاف کر دو۔ہم بیٹی کی اہمیت کو کبھی سمجھ ہی نہیں پائے۔بھارتی نے دونوں کی آنکھوں سے آنسو پوچھے اور بولی کہ آپ تو ہمارے بڑے ہیں آپ لوگوں سے ناراض ہونے کا تو میں سوچ ہی نہیں سکتی۔پھر بولی، ’’بس اب ٹائم نہیں ہے کیونکہ وقت پر پہنچنا ہے۔جلدی سے تیار ہو جاؤ۔‘‘

تھوڑی ہی دیر میں بھارتی کے گھر والے کچھ شرمندگی کچھ خوشی کے ملے جلے سنگم کے ساتھ اسکول کیمپس میں موجود تھے۔اپنے گاؤں کا نام روشن کرنے والی اس بٹیا کو دیکھنے کے لیے مانو پورا گاؤں امڑ پڑا ہو۔چھوٹے چھوٹے بچے بھی حیرانی سے اپنی اس بھارتی دیدی کو دیکھ رہے تھے۔گاؤں کے لوگ اسے اپنا ہیرو ماننے لگے تھے۔آس پاس کے گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ میڈیا و نیوز چینل والے بھی کوریج کے لیے آئے ہوئے تھے۔پروگرام شروع ہوا۔بھارتی کو اسٹیج پر بلایا گیا۔بھارتی نے تعلیم کی اہمیت اور بیٹیوں کی ضرورت پر ایک زوردار تقریر کی۔اس نے بتایا کہ سماج اور ملک کی ترقی کے لیے بیٹیوں کی کیا اہمیت ہے۔اور اس نے کہا کہ ترقی کی منزل کو پار کرنے کے لیے پڑھی لکھی لڑکی کیوں ضروری ہے۔گاؤں والوں نے اپنی تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے اسکی بات کی تائید کی۔

پھر وہ وقت آیا جس کا اسے اتنے دنوں سے بے صبری کے ساتھ انتظار تھا۔منچ پر کھڑی بھارتی کی آنکھیں اپنی پیاری ماں کو تلاش کر رہی تھیں۔پھر یہ تلاش کامیاب ہوئی اور اسے ایک طرف ماں کھڑی نظر آئی۔بھارتی نے اپنے ساتھ کھڑے ایک ٹیچر سے ماں کو اوپر لانے کے لیے درخواست کی۔ماں اب اسٹیج پر آ گئی تھی۔بھارتی اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر جھنڈا پھیرانے والی جگہ پر اپنے ساتھ لے گئی۔ماں کے ساتھ مل کر اس نے طاقت، امن اور خوشحالی والے ترنگے کو پھیرایا۔ترنگے سے جھڑتی پھولوں کی پنکھڑیوں نے اپنی خوشبو کی برسات سے بھارتی کا استقبال کیا۔قومی ترانہ جن گن من بجنا شروع ہوا اور موجود سبھی لوگ کھڑے ہو کر قومی ترانہ گانے لگے۔بھارتی نے دیکھا اس کے باپ اور دادی بھی اس کو پچھتاوے کی جھلملاتی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔اور شرمندگی کی وجہ سے گاؤں والوں سے آنکھیں چار نہیں کر پا رہے ہیں۔بھارتی من ہی من سوچ رہی تھی یہ تو محض ایک شروعات ہے۔ابھی ہماری منزل بہت آگے ہے۔ابھی ہم کو ایک بہت بڑی ڈاکٹر بننا ہے اور گاؤں والوں کا علاج کر کے ان کا من جیتنا ہے۔پھر سماج میں پھیلی لڑکیوں سے نفرت کی برائی کو دور کرنے کے ساتھ، بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ کے نعرے کو بھی کامیاب کرنا ہے!!!!

❑❑❑

عافیہ حمید

اے۔ ۳/۱۴۲۹، نزد مینا مارکیٹ اندرا نگر، لکھنؤ

7897811988

افسانچہ

کانچ کی گڑیا

اماں کے آخری الفاظ یہی تھے ”کانچ کی گڑیا کو پتھروں کا صحن نصیب ہوا“۔ ابا سکتے میں کبھی مجھے کبھی اماں کے بے جان جسم کو دیکھتے۔ اچانک کتوں کے بھونکنے کی آواز تیز ہوگئی تھی۔ بارش تھی کہ رکنے کا نام نہ لیتی۔ گھر جگہ جگہ سے بوسیدہ ہو چکا تھا۔ بارش کی بوندوں نے دیوار اور چھت سب کو بے رنگ کر دیا تھا۔

فجر کی اذان ہوتے ہی محلے کے لوگ ہمارے صحن میں جمع ہونے لگے۔ ہر ایک کی زبان پر اماں کی پاکیزگی کی باتیں تھیں۔ ان کے صبر و استقامت اور وفاداری کے قصے تھے۔ اماں کا نورانی چہرہ کفن میں لپٹا تھا مگر نہ جانے کیوں اماں کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آج بھی وہی انتظار تھا جو ہمیشہ میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ اماں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ اماں کو ان کے میکے میں پیار سے گڑیا پکارتے۔

نانا کو جب زیادہ پیار آتا تو کہتے میری کانچ کی گڑیا۔ اماں تھیں بھی بالکل نازک، دبلی پتلی، اجلا رنگ، خوبصورت آنکھیں۔ اماں کی انگلیاں بالکل نازک تھیں۔ ذرا سل بٹے پر مسالہ پیس لیتیں تو گھنٹوں انگلیاں جلتی رہتیں اور ہتھیلی بالکل سرخ ہو جاتی۔ مگر اماں کے نصیب کا کیا کہا جائے!!؟ جب اماں دس برس کی تھیں تبھی نانا کا انتقال ہو گیا۔ زندگی ایک موڑ پر رک گئی تھی۔ مگر اماں کی خوبصورتی دیکھتے ہوئے اچھے گھروں کے رشتے آنے لگے۔ نانی کا کہنا تھا کسی مذہبی گھرانے میں بچی کا بیاہ کروں گی تاکہ اس کے شوہر کو اللہ کا خوف ہوگا۔ بیوی بچوں کے حقوق پہچانے گا۔ اور نانی کی زبان مبارک۔ گاؤں کے مشہور صوفی کے گھر اماں کی نسبت ٹھہری۔ نانی کی خواہش پوری ہوئی تھی۔ اماں سرخ جوڑے میں کچے آنگن سے پکے صحن میں آ گئی تھیں۔ نانی نے رخصتی کے وقت اماں کو قرآن پکڑاتے ہوئے کہا: ”گڑیا! سرخ جوڑے میں بھیج رہی ہوں، واپسی اجلے لباس میں ہو۔ مرحوم باپ اور بوڑھی ماں کا واسطہ۔۔۔ شوہر مجازی خدا ہے۔“

اماں نے نانی کی باتوں کو کوئی آسمانی قول سمجھ کر اس پر اس طرح ایمان لائیں کہ دنیا اِدھر سے ادھر مگر اماں اپنے ایمان کو بچا ہر غم سہہ گئیں۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ابا اور بھائی کو دو ہی کاموں میں مصروف پایا۔ یا تو ابا اور بھائی اپنے کاروبار کو بڑھانے کی فکر میں رہتے یا پھر دینی کاموں سے اکثر باہر رہتے۔ میں مدرسہ سے گھر آتی تو کبھی اماں کو کپڑے دھوتے دیکھتی کبھی کھانا پکاتے۔ کبھی دادی اور پھوپھی کی خدمت گزاریاں کرتے دیکھتی۔ زندگی پھر بھی پرسکون تھی۔ مگر ایک دن گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ دادی اور پھوپھی مسکرا رہی تھیں مگر اماں کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ میں نے اماں سے پوچھا تو اماں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اماں خاموشی سے روتی رہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مگر شام ہوتے ہی ابا نئی شیروانی پہنے مسکراتے کہیں عجلت میں نکل گئے۔ برابر کا کمرہ صاف کیا گیا۔ رات تک ہمارے گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے اس رات اماں رات بھر جائے نماز پر کھڑی رہیں۔ اماں روتی جاتیں اور دعائیں مانگتیں۔ میں تو کئی دن ابا کے سامنے نہیں گئی۔ اماں کی ہنسی اس دن کے بعد کبھی گھر میں نہیں گونجی۔ کچھ دنوں کے بعد گھر میں نئے مہمان کی آمد ہوئی۔ میں نے دیکھا اماں نے اس وقت بھی دل بڑا کر کے نئی اماں کی خوب خدمت کی۔ زندگی ایک رفتار سے دوڑنے لگی۔ بہن کے بعد ایک بھائی کی کلکاری بھی ہمارے صحن میں گونجنے لگی۔ گھر کا آنگن ایک بار پھر آباد ہو چکا تھا مگر اماں کے دل کا آنگن ویران ہو چکا تھا۔ جب کبھی اماں دادی یا پھوپھی سے اماں کا شکوہ کرتیں، دادی پھوپھی اماں کو دین و مذہب کا حوالہ دے کر چپ کرا دیتیں۔

اماں خود ہی شکوہ نہ کرتیں اگر ابا نئی اماں کے آ جانے کے بعد مجھے اور اماں کو بھول نہ گئے ہوتے۔ ابا سوائے کھانا کپڑا کے اپنی تمام ذمہ داریوں کو بھول چکے تھے۔ ہاں، کبھی کبھی ابا میرے رشتے کو لے کر دادی سے مشورہ ضرور کرتے۔ اماں اور دای کو لگتا تھا میرا رشتہ کسی مذہبی گھرانے میں ہو۔ ابا کی کوشش کامیاب ہوئی۔ مسجد کے امام صاحب کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا۔ اس دن ابا نے برسوں بعد اماں کا نام لے کر پکارا۔ نفیسہ بیگم! مریم کا رشتہ آیا ہے۔

آج شام کچھ مہمان آئیں گے۔ کچھ خاص اہتمام کر لو۔ میں نے دیکھا اماں کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ابا کے سامنے اماں کی کیا مجال تھی کہ وہ کچھ کہتیں۔ بس اماں نے میری طرف حسرت سے دیکھا۔ میری روح کانپ گئی۔ اماں کی زندگی کی تصویر ایک بار میرے سامنے گردش کرنے لگی۔ شام کو گھر میں مہمانوں کی آؤ بھگت کی تیاریاں ہو رہی تھیں مگر اماں خاموش تھیں۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ بس مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ شام کو مہمان آئے اور رسم کی انگوٹھی پہنا گئے۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ اماں کے سسکنے کی آواز پر میری نیند کھل گئی۔ اماں اماں، میرا گلا روند گیا۔ ابا! دادی! پھوپھی! میں نے آواز لگائی۔ جب تک ابا دادی آتے اماں کی سانس اکھڑ گئی۔ مگر اماں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انگوٹھی کو بغور دیکھا اور کہا تمہارا نام مریم ہے۔ تم کانچ کی گڑیا نہیں۔ کانچ کی گڑیا کو پتھروں کا صحن نصیب ہوا۔ اماں کی آنکھیں کھلی رہیں۔ لاکھ کوششوں کے بعد بھی وہ بند نہیں ہوئیں۔ رات بستر پر لیٹتے ہی اماں کے بستر پر نظر پڑی۔ اماں کا بستر خالی تھا۔ مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا آج اماں چین سے سو رہی تھیں۔ اماں کا ہاتھ میری انگلیوں کو چھوتا ہوا انگوٹھی تک پہونچا۔ اچانک لگا، کسی نے انگوٹھی میری انگلی سے نکال لی ہو۔ میں نے اپنی انگلی کو ٹٹولا۔ واقعی انگوٹھی غائب تھی۔

❑❑❑

شاہد عباس

مفتی گنج، چوک، لکھنؤ

9839346181

ترقیات

اتر پردیش میں غریبوں کیلئے اپنا گھر

یو پی کی ہاؤسنگ ایجنسیوں میں ایک نوڈل ایجنسی کے طور پر نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کا قیام اپریل 1966 میں ریاست کے رہائشی مسائل پر قابو پانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اپنے قیام سے لے کر اب تک اس کونسل نے رہائشی علاقوں میں کافی ترقی کی ہے اور اب بھی کر رہی ہے۔ ہڈکو کے زیر اہتمام قومی سطح کا ہاؤسنگ مقابلہ 1976 اور 1979 میں کونسل نے جیتا تھا۔ جنرل ہاؤسنگ پروجیکٹ کے علاوہ، UPAVP ریاست کی تمام قسم کی شہری رہائشی ترقیاتی اسکیموں کی منصوبہ بندی، ڈیزائن، تعمیر اور ترقی جیسے مختلف کاموں میں بھی حصہ لے رہی ہے۔ UPAVP نے مختلف منصوبوں کی منصوبہ بندی کی ہے اور کامیابی کے ساتھ ان پر عملدرآمد کیا ہے۔

مزید برآں، UPAVP نے صحت اور تعلیم کے مختلف ترقیاتی منصوبوں کی منصوبہ بندی اور کامیابی کے ساتھ ان پر عمل درآمد کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کونسل نئے ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹرز کے پراجیکٹس پر بھی کام کر رہی ہے، جس کے تحت مختلف سکیموں پر کام جاری ہے۔ UPAVP اس قدر قابل ہے کہ یہ رہائشی کالونیوں اور شہروں میں بڑے پیمانے پر کام کرسکتا ہے۔ UPAVP ایک خودمختار ادارہ ہے اور یہ کونسل اپنے تمام کام اپنے وسائل کا استعمال کرتے ہوئے انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اگر دوسرے وسائل کی ضرورت ہو تو وہ مختلف مالیاتی اداروں جیسے ہاؤسنگ اینڈ اربن ڈیولپمنٹ کارپوریشن، یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا، ایل آئی سی، بینکس، ایچ ڈی ایف سی وغیرہ کی مدد سے بنائے جاتے ہیں۔ سال 2008-09 کے لیے 115976 لاکھ روپے کی بجٹ آمدنی اور 93169 لاکھ کے اخراجات کے ساتھ، UPAVP کی مالی بنیاد مضبوط ہے۔ گزشتہ کئی سالوں کے دوران، کونسل نے تمام قسم کے رہائشی اور شہری ترقیاتی منصوبوں میں خود کو بہتر ثابت کیا ہے۔ UPAVP ٹرن کی بنیاد پر ہندوستان کے اندر یا باہر کسی بھی پیمانے کے منصوبوں کو انجام دینے کے قابل ہے۔ UPAVP نے 137 شہروں میں اپنی سرگرمیوں کے لیے مطلع کیا ہے۔ کونسل نے 78 شہروں میں 24.621 ہیکٹر اراضی حاصل کی ہے، جس پر ہاؤسنگ سکیمیں نافذ کی گئی ہیں۔ UPAVP نے اب تک مختلف سائز کی 280247 زمینیں اور مکانات تیار کیے ہیں، جو معاشرے کی ضرورت کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ یہ سماج کی بہتری کے لیے UPAVP کی طرف سے ایک چھوٹا سا تعاون ہے۔

انسانی وسائل UPAVP ایک پیشہ ورانہ طور پر منظم تنظیم ہے جس میں فن تعمیر، ٹاؤن پلاننگ، تعمیراتی ٹیکنالوجی، انفراسٹرکچر ڈیزائن، عملدرآمد اور دیکھ بھال، مالیاتی انتظام وغیرہ جیسے مختلف شعبوں کے ماہرین شامل ہیں۔ سینئر ماہرین اور افسران اور انتظامی سربراہان کونسل کے مختلف شعبوں کو سنبھال رہے ہیں۔ معیار UPAVP نے اپنے تمام کاموں میں معیار کا پورا خیال رکھا ہے، جس کے لیے اس نے اپنا کوالٹی کنٹرول مینوئل تیار کیا ہے۔ کونسل نے ایک مرکزی لیبارٹری اور کئی علاقائی ٹیسٹنگ لیبارٹریز قائم کی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی سائٹ لیبارٹریز ہیں جن میں کونسل کی تمام اسکیمیں مربوط ہیں۔ شفافیت کونسل کی طرف سے کسی بھی کام کو انجام دینے کے لیے کچھ مقررہ اصول وضوابط بنائے گئے ہیں۔ کونسل کے تمام قواعد وضوابط کو گزٹ نوٹیفکیشن کے ذریعے عام کر دیا گیا ہے۔ بے سہارا لوگوں کے لیے رہائش رہنے کے لیے گھر سب کو چاہیے لیکن اس کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جن کے پاس سر ڈھانپنے کے لیے چھت تک نہیں ہوتی جس کے بعد وہ عوامی مقامات پر رہنے پر مجبور ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے" آشریہ یوجنا" کے تحت مختلف مقامات پر 8480 رہائشی یونٹ بنائے گئے ہیں۔ متوسط طبقے کے لیے ہاؤسنگ سکیم مزید برآں، نچلے متوسط طبقے کے لوگ ہیں جنہیں اس طرح کی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے، UPAVP نے اب تک 200000 ہاؤسنگ یونٹ بنائے ہیں، اور اس مالی سال میں مزید 550 ہاؤسنگ یونٹس بنانے کا بھی منصوبہ ہے۔

ملٹی اسٹوری کمرشل آرکیڈ اور آفس ان کاموں کے علاوہ، UPAVP نے کثیر المنزلہ دفاتر اور تجارتی ٹاورز تعمیر کیے ہیں، جو خود کونسل کے زیر استعمال ہیں اور عوامی استعمال کے لیے کھلے ہیں۔ عوامی سہولیات کی فراہمی بھی کونسل کی ترجیح ہے۔ نئی انتظامی تکنیک جدید انتظامی تکنیکوں کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے، UPAVP نے اپنی تیز رفتار ترقی کے لیے مختلف جدید طریقوں اور تکنیکوں کو اپنایا ہے، جیسے: بات چیت کے ذریعے زمین عام طور پر زمین کے حصول کا عمل وقت طلب اور بوجھل ہوتا ہے۔ UPAVP اب شہری رہائشی پروگراموں کو نافذ کرنے کے لیے کسانوں/ زمین کے مالکان سے براہ راست بات چیت کرتا ہے۔ زمین کے حصول کا یہ عمل کافی آسان اور کامیاب ثابت ہوا ہے۔ UPAVP" فائدے کی تقسیم کی بنیاد پر" زمین حاصل کرنے کا بھی منصوبہ رکھتا ہے۔ یہ تعمیری قدم زمین کے مالکان کو اپنی زمین رہائشی اور شہری ترقیاتی منصوبوں کے لیے پیش کرنے کی ترغیب دے گا۔ UPAVP مشترکہ طور پر نجی ڈویلپرز اور تنظیموں (اشرافیہ رہائش کے لیے) کے ساتھ معاہدہ کر رہا ہے۔ اس کے بعد جدید ٹیکنالوجی اور زلزلہ مزاحم ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے نئے مکانات بنائے گئے۔ مینوفیکچرنگ سینٹر نئے مینوفیکچرنگ مواد کو بنانے اور نافذ کرنے کے مقصد کے ساتھ، UPAVP نے ریاست میں اپنے 4 مینوفیکچرنگ مراکز قائم کیے ہیں۔ کونسل اور دیگر بلدیاتی اداروں کی مختلف ہاؤسنگ سکیموں کے ذریعے ان مراکز میں نیا مواد تیار کیا جا رہا ہے۔ عوامی ازالہ الاٹیوں اور زمین کے مالکان وغیرہ کے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے کونسل میں 1997 سے عوامی ازالہ کا نظام نافذ کیا جا رہا ہے۔ روبرو سماعت اور موقع پر فیصلہ کرنے کا انتظام ہے۔ عوام کے سوالات سننے اور ان کے حل کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ کونسل نے اپنی سرگرمیوں کو بڑے پیمانے پر دوسرے محکموں اور ایجنسیوں میں متنوع کر دیا ہے۔ اس وقت کونسل کے پاس 63.333 کروڑ روپے کے منصوبے ہیں جن میں 4 سے 10 کثیر المنزلہ عمارتوں کی تعمیر اور ان کا بنیادی ڈھانچہ شامل ہے۔ 300 بستروں کی گنجائش والے ہسپتال، مختلف سرکاری محکمے، ضلعی ہیڈکوارٹرز کی مجموعی ترقی اور تعمیرات اور بہت بڑے گروپ ہاؤسنگ تعمیر کیے جا رہے ہیں۔

❑❑❑

جناب وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ راجدھانی لکھنؤ میں ڈبل ڈیکر بس کو ہری جھنڈی دکھا کر افتتاح کرتے ہوئے۔

جناب وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ’گومتی کتاب میلہ‘ میں طلباء وطالبات کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے۔

वर्ष : 78 अंक 3
जुलाई, 2023
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए शिशिर, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3–सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक– **रेहान अब्बास**